پرچھائیں

پرچھائیں

افسانے اور خاکے

نقاش
جبران خلیل جبران ○ حبیب اشعر
عکاس

گوشۂ ادب، چوک انارکلی لاہور

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

طبع اوّل ایک ہزار

(اشرف پریس لاہور میں طبع ہوئی)

صادق الخیری کے نام!

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

فہرس

پرچھائیں

یہ ایک شخص کی کہانی ہے، جس نے برف سے دبی اور ہواؤں
سے کانپتی رات میں ہمیں اپنے گھر بلایا، جو آبادی سے دُور ——
وادیٔ قادیشا کے کنارے، تنہا واقع تھا۔
ننگیلی لکڑی سے —— جو اس کے ہاتھ میں تھی —— آتشدان
کی راکھ کریدتے ہوئے اس نے کہا:
"میرے دوستو! تم چاہتے ہو کہ میں اپنے غم کا راز تم پر ظاہر کروں۔
وہ ٹریجیڈی تمھیں سناؤں، جسے ایک تصوّرِ شب در فرو میرے سینہ میں

برپا کئے رہتا ہے۔

تم میرے سکوت اور اخفائے راز سے اُکتا چکے ہو۔ میری بے چینی اور ٹھنڈے سانسوں نے تمہیں پریشان کر دیا ہے اور تم ایک دوسرے سے کہتے ہو! جب یہ شخص ہمیں اپنے درد و غم کے ہیکل میں داخل نہیں ہونے دیتا تو ہم اس کی دوستی کے گھر میں کیسے داخل ہو سکتے ہیں۔

تم سچ کہتے ہو! میرے دوستو! جو کوئی ہمارے غم میں شریک نہیں ہوتا، وہ کبھی اور کسی حال میں ہمارا ساتھ نہیں دے سکتا۔

اچھا! تو اب میری کہانی سُنو! سُنو، لیکن ہمدرد بننے کی کوشش نہ کرنا۔ اس لئے کہ ہمدردی کمزوروں کے لئے جائز ہوتی ہے اور میں اپنے غم کے بل پر ہنوز طاقتور ہوں۔

ابھی میں نے جوانی کی منزل میں قدم رکھا ہی تھا کہ نیند اور بیداری کے خوابوں میں ایک انوکھی شکل اور نرالی وضع کی عورت کی پرچھائیں مجھے نظر آنے لگی۔ میں لمبی رات کی تنہائیوں میں اسے اپنے بستر کے قریب کھڑے دیکھتا اور تنہائی کی خاموشیوں میں اس کی آواز سُنتا تھا۔ کبھی کبھی جب میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا، تو مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کی انگلیاں میری

پیشانی کو مس کر رہی ہیں۔ میں گھبرا کے ایک دم آنکھیں کھول دیتا اور اپنی سماعت کی تمام تر قوتوں کے ساتھ "لاشئے" کی سرگوشیوں پہ کان لگا دیتا۔

میں اپنے دل سے پوچھا کرتا: کیا میری آوارگی خیال مجھے کہیں گم کر کے ہی رہے گی؟ کیا میں نے اپنے خوابوں کے تخیلات سے ایک خوبصورت، خوش آواز اور نرم و نازک عورت بنائی ہے کہ وہ اس عالم مادی سے تعلق رکھنے والی جیتی جاگتی عورت کی جگہ لے لے؟ کیا میرا دماغ چل گیا ہے کہ میں نے عقل کی پرچھائیوں سے اپنے لئے ایک رفیقہ کی تخلیق کی ہے؟ جسے میں چاہتا ہوں، جس سے مجھے اُنس ہے، جس پہ میں بھروسہ کرتا ہوں، جس سے قریب ہونے کے لئے میں لوگوں سے دور ہو رہا ہوں۔ جس کی صورت دیکھنے اور آواز سننے کے لئے میں دنیا کی ہر صورت اور ہر آواز کی طرف سے اپنی آنکھیں اور اپنے کان بند کر رہا ہوں؟ — تو کیا میں دیوانہ ہوں؟ سودائی ہوں؟ جس نے عزلت پسندی ہی پر اکتفا نہیں کی، بلکہ تنہائی کی پرچھائیوں سے اپنے لئے ایک رفیقہ — ایک شریکۂ حیات بھی پیدا کر لی۔

میں نے "شریکۂ حیات" کہا ہے اور تم لوگ اس لفظ پہ تعجب

کر رہے ہو۔ لیکن اس عالم ہستی سے ماورا کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں، جن سے ہم صرف متعجب ہی نہیں ہوتے، بلکہ انکار بھی کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ہمیں ناممکنات میں سے نظر آتی ہیں۔ لیکن ہمارا یہ تعجب اور انکار ان کی حقیقت کو محو نہیں کر سکتا، جو ہمارے نفس میں ایک مستحکم عمارت کی طرح قائم ہے۔

یہ خیالی عورت میری شریکہ حیات تھی، جو زندگی کی ہر خواہش، ہر کشش، ہر خوشی اور ہر رغبت میں میرا ساتھ دیتی۔ میں صبح اٹھتا، تو دیکھتا کہ وہ بستر کے تکیوں سے ٹیک لگائے، مجھے ان نگاہوں سے تک رہی ہے، جو بچپن کی پاکیزگی اور ماں کی مامتا سے لبریز ہیں۔ کوئی کام کرنا چاہتا، تو وہ میرا ہاتھ بٹاتی۔ کھانے کے لئے دستر خوان پر بیٹھتا، تو وہ میرے سامنے بیٹھ کر مجھ سے گفتگو کرتی اور جب شام ہوتی، تو میرے قریب آتی اور کہتی:۔

"اب ہمیں یہاں بہت دیر ہو گئی۔ آؤ! ٹیلوں اور وادیوں کی سیر کریں!"

میں فوراً کام چھوڑ دیتا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر سیر کے لئے چل کھڑا

ہوتا، یہاں تک کہ ہم جنگل میں جا پہنچتے، جس پر طلسم سکوت کے تاروں سے بنی ہوئی شام کی نقاب پڑی ہوتی اور ایک بلند چٹان پر پہلو بہ پہلو بیٹھ کر دُور افق پر نگاہیں جما دیتے۔ وہاں کبھی تو وہ غروب ہوتے سورج کی شعاعوں سے سنہری بادلوں کی طرف اشارہ کرتی اور کبھی اس پرندہ کی چہکار کی طرف توجہ دلاتی، جو شب گزاری کے لئے شاخوں پر پناہ لینے سے پہلے خدا کی حمد و تسبیح میں مشغول ہوتا۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں اپنے کمرہ میں بیقرار و مضطرب بیٹھا ہوں کہ وہ آگئی اور جوں ہی میری نگاہ اس پر پڑی، بے قراری، سکون سے بدل گئی اور اضطراب، اُنس و یگانگی سے!

بارہا میں لوگوں سے دوچار ہوا ہوں اور میری روح باغیانہ انداز میں ان کی فطرت کے بُرے پہلوؤں کے خلاف صف آرا ہوئی ہے۔ لیکن جہاں ان کے چہروں میں مجھے اس کا چہرہ نظر آیا، میرے باطن کا تمام طوفان، سماوی نغموں میں تبدیل ہو گیا۔

بسا اوقات یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ میں تنہا بیٹھا ہوں، میرے دل میں زندگی کے مصائب و آلام کی تلوار ہے اور گمرہی میں رہنے کی مشکلات اور

دشواریوں کی زنجیر، لیکن مڑکے جو دیکھتا ہوں، تو وہ میرے سامنے کھڑی مجھے اُن نگاہوں سے دیکھ رہی ہے، جن سے رونق و نور کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔ اسے دیکھتے ہی غم کے سارے بادل چھٹ گئے، دل خوشی کے راگ الاپنے لگا اور زندگی چشم بصیرت کے سامنے عشرت و مسرّت کی جنت بن کے جلوہ گر ہو گئی۔

تم مجھ سے سوال کروگے، میرے دوستو! کہ میں اس انوکھی حالت پر کیسے قانع رہا؟ پوچھوگے کہ انسان، عنفوان شباب میں اس چیز پہ کیسے اکتفا کر سکتا ہے، جسے وہم اور خواب و خیال —— بلکہ نفسی روگ سے تعبیر کیا جاتا ہے؟ تو اس کا جواب میں یہ دوں گا کہ اپنی عمر کے چند سال، جو میں نے اس حالت میں گزارے، وہ اس حسن، سعادت، لذّت اور اطمینان کا نچوڑ تھے، جن سے میں اپنی زندگی میں آشنا ہوا۔ کہوں گا کہ میں اور میری یہ اتھری رفیقہ ایک آزاد اور مجرّد فکر تھے، جو سورج کی روشنی میں طواف کرتی ہے، سمندر کی سطح پر تیرتی ہے، چاندنی راتوں میں دوڑتی ہے اور وہ نغمے گنگناتی ہے، جنھیں کسی کان نے نہیں سُنا، اس منظر کے سامنے کھڑی ہوتی ہے، جسے کسی آنکھ نے نہیں دیکھا۔

زندگی ——— تمام و کمال زندگی ——— ہمارے روحانی تجربات میں ہے اور ہستی ——— تمام تر ہستی ——— وجود کے عرفان و تحقیق میں، جس سے ہم خوش ہوتے ہیں، یا اس کی وجہ سے دردناک۔ اور مجھے ایک روحانی تجربہ ہو گیا تھا شب و روز ہوتا رہتا تھا ——— یہاں تک کہ میں تئیس ۳۰ برس کا ہو گیا۔

کاش! میں تئیس ۳۰ برس کا نہ ہوتا! ——— کاش! اس عمر کو پہنچنے سے پہلے مجھے ایک ہزار ایک، بار موت آ جاتی! جس نے میرا جوہرِ حیات سلب کر لیا اور میرے دل کا سارا خون نچوڑ کر مجھے شب و روز کے سامنے ایک تنہا، خشک اور بے برگ و بار درخت کی طرح کھڑا کر دیا جس کی شاخیں نہ ہوا کے نغموں پر رقص کرتی ہیں، نہ پرندے اس کے پتوں اور پھولوں کے درمیان اپنے آشیانے بناتے ہیں۔"

وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی دونوں کلائیاں ڈھیلی پڑ کر کرسی کی ہتھیوں پر لٹک گئیں اور وہ یاس و نومیدی کا مجسمہ معلوم ہونے لگا۔ ہم سب خاموش بیٹھے، اس کی بات ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر

کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور ڈوبتی ہوئی آواز میں، جو مجروح ہستی کی گہرائیوں سے نکل رہی تھی، کہا:-

"بیس ۲۰ برس کا ذکر ہے: میرے دوست والی لبنان کے حاکم نے ایک علمی مہم کے سلسلہ میں مجھے دینس بھیجا اور وہاں کے محافظ کے نام ایک خط میرے ساتھ کر دیا، جس سے اس کی ملاقات قسطنطنیہ میں ہوئی تھی۔

میں لبنان کو خیرباد کہہ کے اطالوی جہاز میں سوار ہوا۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ روحِ بہار ہوا کی تہوں میں سرسرا رہی تھی، سمندر کی موجوں کے ساتھ اِٹھلا رہی تھی اور آسمان پر سفید بادلوں کے ہجوم میں قلابازیاں کھانے والی دلفریب صورتوں کے پیکر میں ظاہر ہو رہی تھی۔ ان شب و روز کی تعریف، جو میں نے جہاز میں گزارے، تم سے کس طرح بیان کروں؟ جو کلام انسان سمجھتا بوجھتا ہے، وہ اس کے ادراک و احساس کی حدوں سے متجاوز نہیں ہو سکتا اور روح میں ایک ایسی بات ہے، جو ادراک سے کہیں زیادہ بعید اور شعور سے کہیں زیادہ رقیق ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ میں اس زمانہ کی تصویر الفاظ میں کیسے کھینچ سکتا ہوں؟!

وہ چند سال، جو میں نے اپنی اس البیلی رفیقہ کی معیت میں بسر کئے انس و الفت سے ہمکنار تھے اور مسرّت و سکون سے لبریز۔ چنانچہ کبھی خواب میں بھی مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ میری سعادت کے پردوں میں غم چھپا بیٹھا ہے اور میرے ساغر کی گہرائیوں میں تلخی کی گاد! —— نہیں! میں اس پھول کے مرجھانے سے کبھی نہیں ڈرا، جو بادلوں کے دامن میں اُگا تھا اور اس نغمہ کی موت سے کبھی خوف زدہ نہیں ہوا، جو صبح کی پریوں نے گایا تھا۔

جب میں ان ٹیلوں اور وادیوں سے رخصت ہوا، تو میری رفیقہ اس گاڑی میں میرے پہلے سے لگی بیٹھی تھی، جو مجھے ساحل پر چھوڑنے گئی تھی۔

وینس جانے سے پہلے میں تین روز بیروت میں مقیم رہا۔ اس دوران میں میری شریکۂ حیات مجھ سے ایک لمحہ کے لئے جدا نہیں ہوئی۔ جہاں میں جاتا، وہ میرے ساتھ جاتی اور جب ٹھہرتا، وہ بھی ٹھہر جاتی۔ میں اپنے کسی دوست سے ملتا، تو اسے بھی اس سے مسکرا کر ملتے دیکھتا۔ کسی تفریح گاہ میں جاتا، تو اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں محسوس کرتا

اور اپنے کمرہ کی کھڑکی میں بیٹھ کر شہر کی آوازوں پر توجہ صرف کرتا۔ وہ وہ فکر و تامل میں میرا ساتھ دیتی۔ لیکن جب کشتی نے مجھے بیروت کی بندرگاہ سے جدا کیا اور میں نے جہاز پر قدم رکھا، تو اسی لمحہ اپنی فضلئے روح میں ایک تغیر اور ایک طاقت ور مگر مخفی ہاتھ کو اپنا بازو پکڑے محسوس کیا۔ میں نے ایک گہری آواز سُنی، جو سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہہ رہی تھی:

"واپس ہو جا! جہاں سے آیا ہے، وہیں واپس ہو جا! کشتی میں بیٹھ اور جہاز چلنے سے پہلے اپنے ملک کے ساحل کی طرف لوٹ جا!"

آخر کار جہاز روانہ ہوا ——— اور جب ناپیدا کنار سمندر میں جہاز روانہ ہوا، اس کی پشت پر میری مثال کچھ ایسی ہی سی تھی، جیسے فضائے بسیط میں اُڑتے ہوئے باشہ کے چنگل میں چڑیا۔ شام ہونے پر، جب لبنان کی چوٹیاں سمندر کی کہر کے پیچھے روپوش ہو گئیں، تو میں نے خود کو جہاز کے اگلے حصہ پر تنہا کھڑے پایا۔ میرے خوابوں کی پری ——— وہ عورت، جسے میرا دل پیار کرتا تھا ——— وہ عورت، جو میری رفیقۂ شباب

تھی، میرے ساتھ نہ تھی ——— وہ تو میری حسینہ، وہ شیریں کلام محبوبہ جس کا چہرہ، جب بھی میں فضا پہ نگاہیں جماتا تھا، مجھے نظر آتا تھا۔ جس کی آواز، جب بھی میں خاموشی پہ کان لگاتا تھا، مجھے سنائی دیتی تھی اور جس کا ہاتھ، جب بھی میں آگے کی طرف بڑھاتا تھا، میرے ہاتھ سے مَس ہوتا تھا، جہاز میں نہ تھی اور پہلی مرتبہ ——— ہاں! بالکل پہلی مرتبہ میں نے خود کو رات، سمندر اور فضا کے سامنے یکّہ و تنہا محسوس کیا۔

جہاز ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہا اور میں اپنی رفیقہ کو دل ہی دل میں پکارتا رہا۔ ناگن کی طرح بل کھاتی موجوں کو تکتا رہا کہ شاید کفِ سمندر کی سفیدی ہی میں مجھے اس کا چہرہ دکھائی دے جائے۔

جب رات بھیگی، تو جہاز کے مسافر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے، لیکن میں جہاں کھڑا تھا، سرگشتہ و تنہا، حیران و مضطرب وہیں کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے گردن موڑی، تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلہ پر، کہر میں کھڑی ہے۔ مجھے تھرتھری سی آگئی اور میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بلند آواز میں کہا:

" مجھے نہ چھوڑ! خدارا! مجھے اکیلا نہ چھوڑ!! تو کہاں چلی گئی تھی؟ تو

کہاں تھی! میری محبوبہ! میرے پاس آ! آ، میری جان! میرے پہلو میں آ، اور مجھے کبھی نہ چھوڑنا!!"

لیکن وہ میرے پاس نہ آئی۔ بلکہ بے حس و حرکت اپنی جگہ کھڑی رہی۔ اس کا چہرہ رنج و الم کی شدّت سے اتنا بھیانک ہو گیا کہ اس سے زیادہ خوفناک منظر میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ گھٹی ہوئی پست آواز میں اس نے کہا:

"میں تجھے ایک نظر —— ہاں! صرف ایک نظر —— دیکھنے کے لئے سمندر کی گہرائیوں سے آئی ہوں۔ اور اب پھر وہیں واپس جا رہی ہوں۔ تو بھی جا اور اپنی خوابگاہ میں آرام سے سو!"

یہ کہہ کر وہ کہر میں تحلیل ہو گئی۔ میں اسے بھوکے بچّہ کی طرح لجاجت سے پکارتا اور اس کو پکڑنے کے لئے ہر طرف بازو پھیلاتا رہ گیا۔ لیکن شبنم سے گراں بار ہوا کے سوا، اور کچھ میرے ہاتھ نہ آیا۔

مجبور و مایوس میں اپنے کمرہ میں واپس آیا۔ عناصر میری روح میں برسرِ پیکار تھے۔ کبھی گرتے تھے۔ کبھی اُٹھتے تھے۔ بالفاظ دگر میں اس جہاز میں ایک دوسرا جہاز تھا، جو شک و شبہ اور یاس و ناامیدی کے سمندر

ہیں غوطے کھا رہا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر ہے کہ جوں ہی میں نے تکیہ پر سر رکھا، پلکوں پر ایک بوجھ اور جسم میں ایک کسل سا محسوس کیا۔ چنانچہ فوراً ہی میری آنکھ لگ گئی اور میں صبح تک گہری نیند سوتا رہا۔ اس دوران میں، میں نے ایک خواب دیکھا کہ میری رفیقہ سیب کے پھولوں سے لدے ہوئے درخت میں پھانسی پر لٹکی ہوئی ہے۔ اس کے تلووں اور ہتھیلیوں سے خون کے قطرے بہہ بہہ کر درخت کی شاخوں اور تنے پر ٹپک رہے ہیں اور وہاں سے گھاس پر گر کر زمین پر بکھرے ہوئے پھولوں میں جذب ہو جاتے ہیں۔

جہاز روز و شب کی مسافتیں طے کرتا رہا۔ میں اس میں سوار تھا، لیکن اس سے بے خبر کہ میں انسان ہوں، جو ایک انسانی جسم کے سلسلہ میں اپنے طول طویل سفر پر جا رہا ہے، یا ایک پرچھائیں، جو کہر کے سوا، ہر چیز سے خالی فضا میں ماری ماری پھر رہی ہے۔ چنانچہ نہ میں نے اپنی رفیقہ کی قربت محسوس کی، نہ بیداری یا خواب میں مجھے اس کا چہرہ دکھائی دیا۔ میں بے سود محض قوتوں سے گڑگڑا کر دعائیں مانگتا تھا کہ مجھے اس کے مُنہ کی کوئی بات سنوا دیں، یا اس کی ایک جھلک دکھوا دیں۔ اور اگر یہ

ممکن نہ ہو، تو کم از کم مجھے اس قابل کردیں کہ میں اپنی پیشانی پر اس کی انگلیوں کا لمس محسوس کر سکوں۔

چودہ ۱۴ دن تک میری یہی حالت رہی۔ بالآخر پندرھویں دن دوپہر کو دور سے اطالیہ کا ساحل نظر آیا اور اسی دن شام ہوتے جہاز وینس کی بندرگاہ میں داخل ہوا۔ لوگ مسافروں اور ان کے سامان کو جہاز سے اُتار کر شہر میں پہنچانے کے لئے بہت سی کشتیاں لے کر آ گئے۔ جو مختلف رنگوں اور طرح طرح کی تصویروں سے مزیّن تھیں۔

تم جانتے ہو! میرے دوست! وینس بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیروں پر قائم ہے۔ اس کے مکانوں اور عمارتوں کی بنیاد پانی میں رکھی گئی ہے۔ وہاں سڑکوں کی بجائے نہریں ہیں اور گھوڑے گاڑیوں کا کام کشتیوں سے لیا جاتا ہے۔

جب میں جہاز سے اُتر کر کشتی میں آیا، تو ملاّح نے مجھ سے پوچھا:

"کہاں جائیں گے؟ حضور!"

میں نے شہر کے محافظ کا نام لیا، تو اس نے نہایت اہتمام و احترام کے ساتھ مجھے دیکھا اور کشتی کھینے لگا۔

کشتی مجھے لے کر روانہ ہوئی۔ اس وقت رات ہو چکی تھی اور اس نے سارے شہر کو اپنی چادر میں لپیٹ لیا تھا۔ عظیم الشان عمارتوں، عبادتگاہوں اور عشرت کدوں کی کھڑکیاں بجلی کی روشنی سے جگمگا رہی تھیں اور اس روشنی کا عکس متحرک پانی میں پڑ کر ایک ایسا دلفریب منظر پیش کر رہا تھا کہ وہ کسی شاعر کا خواب معلوم ہونے لگا تھا۔

کشتی ابھی پہلی ہی نہر کے موڑ پر پہنچی تھی کہ میں نے بے شمار گھنٹوں کی جھنکار سنی، جو فضا کو غمناک اور ڈراؤنی آوازوں سے لبریز کر رہے تھے گو اس وقت میری ذہنی بے خبری نے مجھے تمام خارجی مظاہر سے بے تعلق کر رکھا تھا۔ لیکن گھنٹوں کا وہ شور، میخوں کی طرح میرے سینہ کو چھید ڈال رہا تھا۔

کشتی ایک سنگین زینہ کے پاس جا کر رک گئی، جس کی سیڑھیاں سطح آب سے شروع ہو کر ایک پختہ راستہ پر تمام ہوتی تھیں۔ ملاح نے مجھے مڑ کر دیکھا اور ایک شاندار مکان کی طرف اشارہ کر کے، جو باغ کے وسط میں تھا، کہنے لگا:

"یہی ہے وہ جگہ!"

میں کشتی سے اُترا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ ملّاح اپنے کندھے پر میرا سوٹ کیس رکھے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ جب میں مکان کے دروازہ پر پہنچا، تو ملّاح کو اس کی اُجرت دے کر رخصت کیا اور اس کے بعد دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھُلا، تو خمیدہ سر خادموں کا ایک گروہ میرے سامنے تھا، جو رو رہا تھا، نالہ و ماتم کر رہا تھا گھُٹی گھُٹی آہیں بھر رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میں حیرت میں رہ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک بوڑھا خادم میری طرف بڑھا اور مجھے مجروح نگاہوں سے دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے پوچھنے لگا:۔

"فرمائیے! کیا ارشاد ہے؟"

میں نے کہا:

"وینس کے محافظ صاحب کا دولت خانہ یہی ہے؟"

اس نے ایجابی طور پر اپنا سر جھکا دیا۔

میں نے حاکم لبنان کا خط نکال کر اُسے دیا۔ پہلے تو اس نے خاموشی سے اس کا پتہ دیکھا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اس دروازہ کی طرف چلا، جو ایوان کے آخری سرے پر تھا۔

یہ سب کچھ ہُوا، لیکن جہاں تک فکر دار اوو کا تعلق ہے، میں بالکل خالی الذہن تھا۔ اس کے بعد میں ایک نوجوان خادم کے قریب گیا اور ان لوگوں کے نوحۂ و ماتم کا سبب دریافت کیا۔ دردناک لہجہ میں اس نے جواب دیا!

"تعجب ہے! آپ نے نہیں سُنا کہ آج محافظ صاحب کی صاحبزادی کا انتقال ہو گیا!"

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر زار و قطار رونے لگی۔

میرے دوستو! اس شخص کی حالت پر غور کرو جس نے ایک مبہم فکر کی مثالی سمندر کا سفر طے کیا اور اس فکر کو ایک قہرمانی قوت نے کف آگیں موجوں اور خاکستری کہر میں تلف کر دیا۔ اس نوجوان کی کس مپرسی و بےچارگی کا اندازہ کرو، جو یاس و نومیدی کی آہ و زاری اور سمندر کی چیخ پکار کے درمیان دو ہفتہ تک مصروف سفر رہا اور جب منزل مقصد و پر پہنچا، تو خود کو ایک ایسے مکان کے دروازہ پر دیکھا، جس کے گوشوں میں درد و الم کی پرچھائیاں رینگ رہی تھیں اور جس کی فضا رنج و غم کی آہ و کراہ سے

بسر نہ تھی۔ اس غریب الوطن انسان کا تصوّر کرو، میرے دوستو! جو ایک ایسے محل میں مہمان ہونے کے لئے پہنچا، جس پر موت کے سیاہ بازو سایہ فگن تھے۔

وہ نوکر، جو میرا خطرے کر اپنے آقا کے پاس گیا تھا، واپس آیا اور مجھ کو دیکھ کر کہنے لگا:

"تشریف لائیے! سرکار آپ کا انتظار فرما رہے ہیں!"

یہ کہہ کر وہ میرے آگے آگے ہو لیا۔ جب ہم اس دروازہ پر پہنچے، جہاں راستہ ختم ہوتا تھا، تو اس نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا اور میں ایک وسیع کمرہ میں داخل ہو گیا، جس کی چھت اُونچی اور فضا شمعوں سے روشن تھی۔ وہاں کچھ پادری اور معزز و مقتدر حضرات بیٹھے تھے، جن پر گہرا سکوت طاری تھا۔ میں بہ مشکل دو چار ہی قدم چلنے پایا تھا کہ صدر سے ایک سفید ریش بوڑھا، جس کی کمر فرطِ غم سے جھک گئی تھی، اور جس کا چہرہ شدتِ الم سے بے رونق ہو گیا تھا، اُٹھا اور میری طرف بڑھ کر یہ کہتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ لیا:

"مجھے سخت اذیت ہے کہ آپ اتنا طول طویل سفر طے کر کے یہاں

تشریف لائے اور ہمیں اپنی عزیز ترین متاع کے غم میں مبتلا پایا لیکن مجھے امید ہے کہ ہماری یہ ابتلا اس غرض کی تکمیل میں حائل نہ ہوگی جس کے لئے آپ نے اتنی زحمت گوارا فرمائی ہے۔ لہٰذا آپ کو بالکل پریشان نہ ہونا چاہیئے!"

میں نے چند بے ربط الفاظ میں اس کی مصیبت پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے اس مہربانی کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد وہ مجھے ایک کرسی کی طرف لے گیا، جو دیوان کے قریب رکھی تھی اور میں بھی حاضرین کی طرح ساکت و صامت بیٹھ گیا۔ نگاہیں بچا کر کبھی تو میں ان کے غمگین چہروں کو دیکھتا تھا اور کبھی ان کی سرد آہیں سنتا تھا، جو میرے دل کے پرخچے اڑائے دیتی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ایک کرکے لوگ وہاں سے چلے گئے اور اس خاموش کمرہ میں میرے اور غمزدہ باپ کے سوا، اور کوئی نہ رہا۔ اس وقت میں کھڑا ہوا، اور اس کی طرف بڑھ کر کہا:

"اب مجھے اجازت دیجیئے!"

التماعی لہجہ میں اس نے جواب دیا:

"عجلت نہ فرمائیے! تشریف رکھیئے! اگر آپ ہمارے رنج و غم کے دیکھنے اور ہماری آہ و فریاد کو سننے کی تاب رکھتے ہیں، تو ہمارے مہمان رہیئے"!

اس کے ان الفاظ نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ اور میں نے امتثالِ امر کے طور پر سر جھکا دیا۔ اس نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ مہمان نوازی میں اہلِ لبنان دنیا کے ہر ملک اور ہر قوم سے ممتاز ہیں، تاہم میں چاہتا ہوں کہ آپ یہاں قیام فرمائیں تاکہ ہم بھی —— گر پورے طور پہ نہ سہی، لیکن آپ کے لئے وہ آسائش بہم پہنچانے کی کوشش کریں، جو ایک پردیسی کو اپنے ملک میں ملتی ہے"!

تھوڑی دیر کے بعد غمزدہ بوڑھے نے نقرئی گھنٹی بجائی اور ایک ملازم، زرکار لباس پہنے کمرہ میں داخل ہوا۔ بوڑھے نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"ہمارے معزز مہمان کو مشرقی کمرہ میں پہنچا دو اور آپ کے اکل و شرب کا خیال رکھو۔ دیکھو! آج سے تمہارا کام بس یہی ہے کہ آپ کے راحت و آرام

میں رتی بھر خلل نہ آنے پائے"!

ملازم مجھے ایک کشادہ اور خوش وضع کمرہ میں لے گیا، جس میں قیمتی فرش بچھا تھا اور جس کی دیواریں، تصویروں اور ریشمی پردوں سے مزیّن تھیں۔ وسط میں ایک نفیس مسہری تھی اور مسہری پر ایک قیمتی کمبل اور کڑھے ہوئے خوشنما تکیے رکھے تھے۔

،، گھنٹے اسی بیقراری کے عالم میں گزر گئے کہ میں کبھی تو کمرہ میں ٹہلنے لگتا اور کبھی کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر فضا کو تکنے لگتا، یا ملّاحوں کی آوازوں اور پانی میں چپوؤں کی جنبشوں پر کان لگا دیتا۔ یہاں تک کہ بیداری نے مجھے تھکا دیا اور میری فکر زندگی کے مظاہر و اسرار میں گم ہو گئی۔ میں مسہری پر گر پڑا اور خود کو ایک نیم شعوری کیفیت کے حوالے کر دیا، جو نیند کی مدہوشی اور بیداری کی ہوشیاری سے مرکّب تھی، جس میں یاد اور فراموشی اس طرح کروٹیں لے رہی تھی، جیسے ساحل پر سمندر کا مدّوجزر!! اس وقت میں ایک خاموش میدان کارزار کی مثالی تھا، جس میں فوجیں خاموشی کے ساتھ برسرِ پیکار تھیں۔ موت کا دیوتا سپاہیوں کو برابر زمین پر دے مار رہا تھا اور وہ خاموشی سے اپنی جان، جان

آفریں کے سپرد کر دیتے تھے۔

میرے دوستو اب مجھے معلوم نہیں کہ میں نے اس حالت میں کتنے گھنٹے گزارے۔ زندگی میں بہت سے میدان ہیں، جنھیں ہماری روحیں طے کرتی ہیں۔ لیکن ہم انھیں مادی پیمانوں سے نہیں ناپ سکتے، جن کی ایجاد انسانی فکر و نظر کی مرہون ہے۔

نہیں! میں نہیں جانتا کہ میری یہ حالت کب تک رہی۔ مجھے تو اس وقت بھی صرف اتنا ہی معلوم تھا اور آج بھی صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ اس نیم شعوری کیفیت کے دوران میں، میں نے اپنے بستر کے قریب ایک زندہ ہستی محسوس کی ——— ایک قوت محسوس کی، جو کمرہ کی فضا میں مرتعش تھی ——— ایک ایتھری وجود محسوس کیا، جو بغیر کسی آواز کے مجھے پکار رہا تھا اور بغیر کسی اشارہ کے مجھ میں جوش و ہیجان پیدا کر رہا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور ایک ہمہ گیر و قوی اثر کے تحت کمرہ سے نکل کر باہر آ گیا۔ میرے قدم غیر ارادی طور پر اٹھ رہے تھے۔ میں اس شخص کی طرح چل رہا تھا، جو سوتے میں چلتا پھرتا ہے اور اس عالم میں چل رہا تھا، جو وقت اور فاصلہ کی قیدوں سے یکسر آزاد تھا۔ یہاں تک کہ میں نے ساری ڈیوڑھی طے

کر لی اور ایک بہت بڑے کمرہ میں داخل ہو گیا۔

کمرہ کے وسط میں ایک لاش رکھی تھی، جس کے دائیں بائیں دو لمپ روشن تھے اور چاروں طرف پھولوں کے ڈھیر لگے تھے۔ میں نے قدم بڑھایا اور جھک کر دیکھا —— اُف! وہ میری محبوبہ کا چہرہ تھا —— میرے خوابوں کی پری کا چہرہ تھا، جس پر موت نے اپنی باریک نقاب ڈال رکھی تھی! —— آہ! میری آنکھوں کے سامنے وہ عورت تھی جس سے میں محبت سے بڑھ کر محبت کرتا تھا۔ سفید پھولوں کے درمیان، سفید کفن میں، وہ سفید و بے جان جسم تھا، جس پر زمانے کی خاموشی اور ازل کی دہشت طاری تھی۔

اے خدا! —— اے محبت، زندگی اور موت کے مالک! تو ہی ہے جس نے ہماری روحوں کو پیدا کیا! اور نور و ظلمت کے اس ہجوم میں پھینک دیا —— تو ہی ہے، جس نے ہمارے دلوں کی تخلیق کی اور انہیں امید و الم کی دھڑکنیں عطا فرمائیں —— ہاں! تو ہی ہے، جس نے میری رفیقہ کو مجھ سے ملایا، لیکن اس وقت، جب اس کا تابناک جسم سرد و بے جان ہو چکا تھا —— تو ہی ہے، جس نے مجھ

پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ موت، زندگی سے کیا چاہتی ہے اور غم، خوشی سے کیا غرض رکھتا ہے، مجھے ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچایا —— تو ہی ہے، جس نے میری وحدت و تنہائی کے جنگل کو ایک سفید چنبیلی کے پھول سے زینت بخشی اور اس کے بعد مجھے دور —— ایک وادی میں —— پھینک دیا، تاکہ میں وہاں اس پھول کو مرجھایا ہوا دیکھوں!

ہاں! میرے دوستو! —— میری غربت وطن اور تنہائی کے رفیقو!

اللہ نے چاہا اور اپنی مشیّت کے لئے مجھے اندرائن کا تلخ جام پلا دیا۔

ہم انسان —— ہم لامحدود فضا کے مرتعش فرّے، اطاعت و فرماں برداری کے سوا، کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم اگر محبت کرتے ہیں، تو وہ محبت ہمارے لئے نہیں ہوتی، بلکہ ہماری طرف سے ہوتی ہے۔ ہم اگر خوش ہوتے ہیں، تو وہ خوشی ہماری ذات میں نہیں ہوتی، بلکہ نفس حیات میں ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر ہم دردناک ہوتے ہیں، تو وہ درد ہمارے زخموں سے نہیں پھوٹتا، بلکہ احشائے فطرت سے پھوٹتا ہے۔

دوستو! میں نے تمہیں یہ کہانی شکر کا بیڑہ نہیں سنائی۔ اس لئے کہ جو کوئی

شکایت کرتا ہے، وہ زندگی پرشک کرتا ہے اور میں صاحب ایمان ہوں۔ اس تلخی کی صلاحیت پر ایمان رکھتا ہوں، جس کا حاصل، ہر وہ گھونٹ ہے، جو میں ساغرِ شب کے ذریعہ پیتا ہوں۔ اُن منجوں کے حسن و دلکشی پر ایمان رکھتا ہوں، جو میرے سینہ کو چھید سے ڈالتی ہیں۔ اُن فولادی اُنگلیوں کی نرمی و ملائمت پر ایمان رکھتا ہوں، جو میرے دل کے پردہ کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کئے دیتی ہیں۔

دوستو! یہ ہے میری کہانی! میں اس کا انجام کیا بیان کروں، جبکہ اس کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ میں اس نوخیز حسینہ کی میّت کے سامنے گردن جھکائے بیٹھا رہا، جیسے میرا دل خواب و خیال کی دُنیا میں چاہتا تھا اور میری نگاہ ایک لمحہ کے لئے اس کے چہرہ سے نہ ہٹی، یہاں تک کہ صبح نے اپنا مُنہ کھڑکی کے شیشوں پر رکھ دیا۔ اب میں اُٹھا اور اپنے کمرہ میں واپس چلا گیا۔ اس عالم میں کہ میری کمر ابدیت کی گراں باریوں سے دوہری ہوئی جا رہی تھی اور میرے ہاتھ میں انسانیت کے درد وغم کا عصا تھا۔

تین ہفتہ وینس میں ٹھہر کر میں لبنان واپس آ گیا۔ اس شخص کی طرح،

جو زمانہ کی گہرائیوں میں ایک ہزار صدیاں گزار کر واپس ہُوا ہو۔ اور ہر اُس لبنانی کی طرح، جو پردیس سے پردیس کی طرف لوٹتا ہے۔

مجھے معاف کرنا! میرے دوستو! کہ میری داستان بہت طویل ہو گئی۔

مُردوں کی فریاد!

ایک فرشتہ قبروں کے محشرستانِ سکوت سے گزرا۔ وہ ہراساں تھا اس شخص کی طرح، جو موت کو دانت نکوسے دیکھ رہا ہو۔ زمین، بہارِ شب سے بہرِ ہ مند تھی۔ گل ریز درخت اپنی شمیم سے قبروں کو ٹہوکے دے رہے تھے۔

قبریں روئیں، اس لئے کہ جو نفوس ان کال کوٹھڑیوں میں بند تھے ان میں کوئی بھی راحت سے ہمکنار نہ تھا۔ سب الم نصیب تھے اور اپنی نیند میں دور دراز امیدوں کے خواب دیکھ رہے تھے۔

فرشتہ نے کہا:

"سو جاؤ! قبریں تمھارے لئے بہترین مسکن ہیں۔ اس لئے کہ یہاں سکون و راحت ہے۔ نفسانیت کی دھما چوکڑی نہیں ہے۔ تم واویلا کیوں کر رہے ہو۔ شاید تمھاری زندگی مصیبتوں اور دشواریوں سے خالی تھی؟ کیا وہ ساری کی ساری پرچھائیوں کی طرح نہیں گزری؟ وہ دیکھو! کتنی زندہ لاشیں ہیں، جو ٹھنڈے سانس بھر بھر کے کہہ رہی ہیں: آہ! موت کتنی خوشگوار ہے!!"

سو جاؤ! بھلا دو، اس شبابِ گاہِ ماضی کو!! افسوس کرو، اس زندگی پر، جو اس کے سوا کچھ نہیں، کہ شب و روز کا مسلسل و غیر منقطع اُلٹ پھیر ہو!!!"

قبروں میں سے زار و نزار آوازوں نے جواب دیا:

"زمین ہم آغوشِ بہار ہو اور ہم سو جائیں!"

ایک قبر نے روتی آواز میں فرشتہ سے کہا:

"پھولوں کی مہک زمین کا دل چیر کر مجھ تک پہنچی۔ مجھے جگا یا اور اس کامنی کو یاد دلایا، جس سے میں محبت کرتا تھا۔ مجھے اجازت دو کہ

میں اُٹھوں اور اسے چنبیلی کی بیلوں میں تلاش کروں، جن کے سائے تلے ہماری محبت پُھلتی اور خوش کام ہوتی تھی۔ شاید میں ان لبوں اور آنکھوں کو دیکھ لوں، جن سے میرے لب کیف محبت پاتے تھے!

میں سمجھتا تھا کہ موت مجھے اس سے ہمکنار کر دے گی، لیکن میرا گمان غلط نکلا اور اب تم دیکھ رہے ہو! اپنی قبر میں اکیلا ہوں۔ یہ جگر کاہ تنہائی! میں یہاں اس سے زیادہ ٹھہرنے کی قوت نہیں رکھتا۔ مجھے اُٹھنے کی اجازت دو!"

فرشتہ نے جواب دیا:

"تیری محبوبہ مر گئی اور چنبیلی کی وہ بیلیں بھی، مدتیں گزریں، سُوکھ گئیں، جن کے سائے تلے تو ذوق آشنائے سعادت ہوا تھا۔ سوجا! کہ میں نے اپنی آنکھ سے اس کا آخری پھول مُرجھا کر زمین پر گرتے دیکھا ہے۔"

اس نے قبر کو اپنے پیروں سے روندا۔ کراہ سے ملتی جلتی ایک آواز اس میں سے نکلی اور قبر پر سناٹا چھا گیا۔

اس کے بعد دوسری قبر نے فریاد کی:

"کیسے سو جاؤں؟ میں درختوں کی سرسراہٹ اور بہتے پانی کی آواز سُن رہا ہوں۔ سونا تو اب کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ جب میں اس قبر میں

نہیں آیا تھا، تو میں نے محبت کا ایک حسین گیت آراستہ کرنا شروع کیا تھا۔ لیکن وہ مرتب نہ ہو پایا کہ موت نے مجھے آ لیا اور اب میں پتوں کی سرسراہٹ میں کچھ ایسا ہی ترنم سُن رہا ہوں —— اپنے اس گیت کے ترنم سے ملتا جُلتا ترنم!

مجھے اجازت دو! کہ میں اُٹھوں اور اپنا گیت پُورا کر لوں جب میں اسے مکمل کر لوں گا، تو حوا کی تمام بیٹیوں کو بطور ہدیہ پیش کروں گا کہ نوجوان ماں اسے اپنے بچہ کے پنگھوڑہ پر گنگنائے اور اچھوتی محبوبہ اپنے منگیتر کے حضور گائے!"

فرشتہ نے کہا:

"تیرے گیت کی آہنگ اپنی صدائے بازگشت چھوڑے بغیر تحلیل ہو گئی۔ تیری نوع کے مردوں اور عورتوں نے اسے فراموش کر دیا۔ اب وہ ادھورا گیت درختوں کے سوا کسی کو یاد نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تو اپنے اس گیت کی دُھن ایک خفیف سرسراہٹ کے ساتھ اپنی قبر پہ سُن رہا ہے کہ تجھے تیری لوری کا لحن سُلا دے!"

فرشتہ نے اپنے قدموں سے قبر کو رگڑا اور فریاد کی آواز آہ بھر کے

خاموش ہو گئی۔

اس کے بعد تیسری قبر روئی اور فریاد کرنے لگی :

" قبر تاریک ہے۔ اس لئے میں نہیں سو سکتا۔ میں اپنی زندگی میں جب کبھی نور کو دیکھتا، اپنے تمام تر وجود کے ساتھ بے اختیار اس کے حسن کی طرف کھنچنے لگتا۔ لوگوں نے اس جمالِ ضیا نواز کے مختلف نام رکھ چھوڑے تھے۔ لیکن میں ناموں کی پروا کئے بغیر مظاہر کے ہر روپ میں اس سے محبت کرتا تھا۔

جب میں بچہ تھا، میری ماں مجھ سے کہا کرتی تھی کہ مرنے کے بعد یہ نور ہمیشہ نظر افروز رہے گا اور میں اس بات کی تصدیق کیا کرتا تھا۔ لیکن میں قبر میں آیا تو یہ کیا ہو گیا کہ تاریکیاں مجھ پر ٹوٹ پڑیں۔ میری آنکھیں اس نور سے محروم ہیں۔ مجھے اُٹھنے دو، شاید میں اسے دیکھ لوں!"

فرشتہ خاموش ہو گیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

آواز نے کہا :

" مجھے جواب دے، اے فرشتہ! معلوم ہوتا ہے: اب زمین بھی اس

نُور سے درخشاں نہیں رہی۔ بتا! بتا!! اگر یہ سچ ہے، تو شاید مجھے نیند آجائے"!

فرشتہ خاموش رہا۔ اس نے قبر کو روندا، نہ قبر کے فریادی کو دلاسا دیا۔ بلکہ متحیر و سرگشتہ کھڑا رہا۔ افسردہ ہو کے گردن جھکا لی، اس لیے کہ مُردہ فریادی کے الفاظ اس کے دل سے ٹکرا رہے تھے اس کا احساس، مُردہ کے احساس سے ہم آہنگ ہوگیا۔ لیکن وہ اُسے قبر سے اُٹھانے پہ قادر نہ تھا۔

کل !— آج !— کل !

(عورت کس طرح دھوکا دیتی ہے ؟)

میں نے اپنے دوست سے کہا :

"اس عورت کو دیکھو ! کل میرے پہلو سے لگی بیٹھی تھی اور آج اس مرد کے پہلو سے لگی بیٹھی ہے !"

میرے دوست نے جواب دیا :

"اور کل میرے پہلو سے لگی بیٹھی ہو گی !"

میں نے کہا :

کل! — آج! — کل!

"دیکھو! کل وہ میری آغوش کی زینت تھی اور آج اس کی آغوش کی زینت ہے!"

اس نے جواب دیا:

"اور کل میری آغوش کی زینت ہو گی!"

میں نے کہا:

"دیکھو! کل وہ میرے ساغر میں شراب پی رہی تھی اور آج اس کے ساغر میں پی رہی ہے!"

اس نے جواب دیا:

"اور کل میرے ساغر میں پیئے گی!"

میں نے کہا:

"دیکھو! کل وہ محبّت بھری نگاہوں سے، آنکھیں بچا بچا کر، مجھے دیکھ رہی تھی اور آج اسے دیکھ رہی ہے!"

اس نے جواب دیا:

"اور کل مجھے دیکھے گی!"

میں نے کہا:

"دیکھو! کل وہ محبت بھرے گیت میرے کانوں میں گنگنا رہی تھی اور آج اس کے کانوں میں گنگنا رہی ہے!"

اس نے جواب دیا:

"اور کل میرے کانوں میں گنگنائے گی!"

میں نے کہا:

"دیکھو! کل وہ مجھ سے ہم کنار تھی اور آج اس سے ہمکنار ہے!"

اس نے جواب دیا:

"اور کل مجھ سے ہم کنار ہو گی!"

میں نے کہا:

"عورت بھی کتنی عجیب ہے؟!"

اس نے جواب دیا:

"وہ زندگی کی مثال ہے جو ہر انسان کو اپناتی ہے! — موت کی مثال ہے، جو ہر انسان پر غالب آتی ہے!! — اور ابدیت کی مثال ہے، جو ہر انسان کو خود میں جذب کر لیتی ہے!!!

ضمیر

قابیلؔ اپنے آقا کی دہلیز سے بھاگا اور جنگلوں کی خاک چھانتا، دم توڑتی روشنی کے سمے، ایک وسیع و ہموار میدان میں پہنچا، جو پہاڑ کے دامن میں آسودہ تھا۔ رستہ کی تکلیفوں نے اس کے بیوی بچّوں کو ادھ مُوا کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ زمین پہ گر پڑے اور خوف و اضطراب کے عالم میں سو گئے۔

وہ سب سو رہے تھے، لیکن قابیلؔ اپنے وسوسوں اور غور و فکر میں غرق بیٹھا رہا۔ نیند اس کی آنکھوں سے اتنی دور تھی، جتنا کہ زحل،

زمین سے۔ اس نے اپنا سر تاریک آسمان کی طرف اُٹھایا اور دیکھا کہ دُور اُفق پر ایک خوفناک آنکھ غصّہ سے اسے گھور رہی ہے۔ وہ مارے دہشت کے کانپنے لگا۔ اپنے دل میں اس نے کہا:

"ابھی تک میں اس کے قریب ہی ہوں!"

وہ کرب زدہ ہو کے اُٹھا۔ بیوی بچّوں کو جگایا اور آگے چل پڑا۔ خوف و رنج کے عالم میں ریگستان کے لق و دق مرحلے طے کئے گیا۔ تیس ۳۰ دن اور تیس ۳۰ راتیں لگاتار چلتا اور بھٹکتا رہا۔ اس سرگردانی نے اس کے چہرہ کی رنگت بگاڑ دی تھی۔ اور حواس پراگندہ کر دیئے تھے۔ رستہ میں اس نے نہ کسی سے بات کی، نہ پیچھے مڑ کے دیکھا اور نہ سویا۔ یہاں تک کہ اشور کے ساحلوں پہ جا پہنچا۔ وہاں اس نے کہا:

"ہمیں عصائے سفر یہیں ڈال دینا چاہیئے! یہاں ہم محفوظ و مامون ہیں —— ہاں! ہمیں یہیں ٹھہر جانا چاہیئے! کیونکہ ہم اس عالم کی حدیں پار کر چکے ہیں۔"

لیکن جب اس نے بیٹھنے کو، جھکتے جھکتے نگاہ اُٹھائی، تو دیکھا: دُور اُفق پہ وہی آنکھ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے۔ ایک شدید اضطراب

اس پر مسلط ہو گیا اور وہ خوف و دہشت کے مارے لرزنے لگا۔ وہ مدد کے لئے چلایا:

"مجھے بچاؤ!"

اس کی اولاد، ہونٹوں پر انگلیاں رکھے کھڑی تھی اور غمناک و رنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

قابیل نے جوبال سے، جو جنگلوں میں رہنے والے خانہ بدوشوں کا سردار تھا، مخاطب ہو کے کہا:

"اس طرف خیمہ کا پردہ ڈال دو!"

جوبال نے پردہ چھوڑ دیا اور اس کے کناروں پر سیسے کے بھاری ٹکڑے رکھ دیئے۔ اس وقت تسیلا نے، جو اس کی پوتی اور صبح کی مانند نرم و دلکش تھی، پوچھا:

"کیا اب بھی تمھیں کوئی چیز نظر آ رہی ہے؟"

قابیل نے جواب دیا:

"ہاں! میں اب تک اسی آنکھ کو دیکھ رہا ہوں!"

جوبال اٹھا، بگل بجایا، ڈنکے پر چوب لگائی اور چلایا:

"ضروری ہو گیا کہ اس کے سوا کوئی دوسری آڑ قائم کی جائے!"

اس نے لوہے کی ایک دبیز دیوار اٹھائی اور قابین کو اس کے پیچھے بٹھا دیا۔ لیکن قابین نے دیکھا اور کہا:

"نہیں! وہ آنکھ ابھی تک مجھے دیکھ رہی ہے!"

جو بال نے کہا:

"ہمیں ایک ایسی مستحکم چار دیواری بنانی چاہیئے کہ کسی کو اس کے پاس تک پھٹکنے کی جرأت نہ ہو۔ یعنی ایک شہر تعمیر کیا جائے، جس میں ایک مضبوط قلعہ بنا کر اسے مقفل کر دیا جائے!"

لوہاروں کا سرخیل: تیبا بال شہر تعمیر کرنے اٹھا اور اتنا عظیم الشان شہر اس نے تعمیر کیا، جو انسانی طاقت سے باہر تھا۔ جب وہ اپنے کام میں مصروف تھا، اس کے بھائی بند، نوش اور شیث کی اولاد کو میدانوں میں بھگا رہے تھے۔ اور جو شخص ادھر سے گزرنے کی جرأت کرتا تھا، اس کی آنکھیں پھوڑ دیتے تھے۔ وہ دن ڈوبنے کے بعد بھی تیر چلاتے اور ستاروں کے سینے چھیدا کرتے!

یہاں تک کہ شہر بن کے تیار ہو گیا۔ خیموں کی جگہ صندوق رکھے گئے۔

چٹانیں لوہے کی زنجیروں میں لپیٹ دی گئیں۔ جو کوئی دیکھتا، یہ خیال کرتا کہ وہ دوزخ کا کوئی حصّہ ہے، اس لئے کہ اس کی دیواریں کیا تھیں، پہاڑ تھے اور اُن کا سایہ جنگلوں کو روشنی سے محروم رکھتا تھا۔ اس کے دروازوں پر یہ نوشتے لگا دیئے تھے:

" یہاں قدم رکھنا منع ہے!"

شہر کی تعمیر و استحکام سے فارغ ہو کر انھوں نے قلعہ کے اندر بیش از بیش حفاظتی انتظامات کئے۔ لیکن قابیل بدستور غمگین و مضطرب رہا۔

تسیلا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا:

" ابّا جان! وہ آنکھ اب تو آپ کو نہیں دیکھ رہی؟"

اس نے جواب دیا:

" نہیں! وہ اب تک دیکھ رہی ہے!"

پھر بولا:

" اب میں زمین کے نیچے رہنا چاہتا ہوں، جس طرح مُردہ قبر میں رہتا ہے۔ تاکہ نہ میں کسی کو دیکھ سکوں، نہ کوئی دوسرا مجھے دیکھ سکے!"

ایک گڑھا کھودا گیا ــــــ بہت گہرا گڑھا۔ قابیل نے کہا:

"بہت خوب!"

اس کے بعد وہ تنہا اس تاریک گڑھے میں اُترا۔ لیکن جب وہ اس ظلمت کدہ کے وسط میں کرسی پر بیٹھا اور گڑھا اُوپر سے پاٹ دیا گیا، تو قبر میں بھی وہ آنکھ اسے گھور رہی تھی۔

سودائی

اس سے پہلے کہ زندگی ہمیں ان جسمانی پنجروں میں اسیر کرے، ہم کہاں تھے؟ اور کیا تھے؟

اس سے پہلے کہ ہمارے جسموں میں بے چین اور بے قرار، یہ صاحب ادراک و احساس روحیں، ان کال کوٹھڑیوں میں بند ہوں، کہاں تھیں؟ اور کیا تھیں؟

اس سے پہلے کہ دن ہمیں ایک ایسے کلام کی شکل میں ادا کریں، جس کے الفاظ صاف، لیکن معنی مبہم ہوں، ہم کس فضائے سکوت میں پرافشاں

تھے ؟

اور اس سے پہلے کہ راتیں ہمارے نفوس کے ہیکل تیار کریں، ہمارے نفوس، ہستی کے کس مرتبہ میں تھے ؟

یہ خوابوں کی پٹی باندھے ہوئے بیداری ——— یہ خیال کی نقاب اوڑھے ہوئے فکر ——— یہ فرحت و الم اور محبت و شیفتگی کے تاروں سے بنی ہوئی امیدیں، شکم مادر میں پیدا ہوئی ہیں، یا بطن اثیر میں ؟

کیا اس سے پہلے کہ شوق حیات، ہمیں آغوشِ حیات کے سپرد کر دے، ہم کوئی حقیقت نہ رکھتے تھے ؟

جب سے میں نے ہوش سنبھالا، یہی سوالات میں اپنے نفس سے کیا کرتا اور میرا نفس ایسے مبہم و مشکوک الفاظ میں ان کا جواب دیتا، جو میری عقل کے کانوں میں پہنچتے، تو میری عقل انھیں ایک گہرے سکوت میں تبدیل کر دیتی، جس طرح برف کے ٹکڑے پانی میں گرتے ہیں، تو پانی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

لیکن کل ایک ایسا حادثہ پیش آیا، جو قریب تھا کہ مجھے غیب کے اسرار دکھادے اور مجھ پر ہستی کے رموز منکشف کر دے۔ کل میں ایک ایسی

بات سے آشنا ہوا، جس نے میرے حافظہ کو اس عالم کی طرف تقریباً لوٹا ہی دیا تھا، جہاں میں اس جسم کا لباس پہننے سے پہلے تھا۔ میں نے ایک شخص کو اپنی ذات کے متعلق کلام کرتے سنا، جس کے الفاظ میری محدود فکر اور عقل عام کے درمیان ایک باریک رشتہ تانتے تانتے رہ گئے!

ہاں! کل میں نے سلیم رتال کو اس کی ذات اور ماضی بعید کی ان یادوں کا ذکر کرتے سنا، جو اس کے ذہن میں محفوظ نہیں اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں ایک ایسے انسان کے حضور میں ہوں، جو اور انسانوں سے مختلف ہے، وہ کچھ محسوس کرتا ہے، جو وہ محسوس نہیں کرتے اور ان باتوں کو یاد رکھتا ہے، جنھیں وہ بھلا چکے ہیں۔

میں سلیم رتال کو دس برس سے جانتا ہوں۔ میں اور میرے دوست اسے "سودائی" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ اس لئے کہ اگر وہ ہم میں سے کسی کو دیکھتا، تو ایسی حیرت ناک نگاہوں سے دیکھتا، گویا اس سے کبھی ملا ہی نہیں ہے۔ اور جب کبھی ہم اسے، اس کا نام لے کر پکارتے، تو اس وقت تک ہماری طرف متوجہ نہ ہوتا، جب تک تین یا چار بار اس کا نام دہرا نہ لیا جاتا۔ اگر ہم اس سے کوئی ایسی بات پوچھتے، جو

اس کے علم میں ہوتی، تو وہ ہماری طرف ایسی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا گویا ہم کسی ایسی زبان میں اس سے بات کر رہے ہیں، جس کا ایک لفظ بھی اس نے اپنی زندگی میں نہیں سُنا۔

بعض اوقات وہ ہلکی سے ہلکی آواز اور معمولی سے معمولی حرکت سے چونک پڑتا، جیسے سونے والا بندوق چلنے کی آواز سن کر چونک پڑتا ہے۔ چنانچہ اگر بیٹھا ہوتا، تو کھڑا ہو جاتا، اور کھڑا ہوتا تو گھبرا کر چلنے لگتا۔ لیکن اس نفسی گمشدگی کے باوجود، وہ بلا کا ذہین، ذہنی صلاحیتوں کا مالک اور بعض امور میں نہایت بعید الفکر تھا۔ خصوصاً علم موسیقی اور علم ہیئت میں اس کا درجہ بہت بلند تھا۔ جب کبھی میں نے اسے عربی نغمات اور ان کے اوزان و معانی پر گفتگو کرتے دیکھا، اس کی دقّتِ نظر اور رقّتِ شعور پر متعجب ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور جب کبھی میں نے ہیئتی مسائل —— مثلاً یہ کہ عالم کہر سے پیدا کر کے فضا میں منتشر کر دیئے گئے ہیں —— پر اس کی رائیں سُنیں، تو یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو گیا کہ میں کسی بہت بڑے عالم ہیئت کی مجلس میں بیٹھا ہوں اور اپنے دل میں کہا کہ اس "مردِ گم شدہ" کی روح میں وہ کچھ ہے، جو "مدّعیانِ خرد"

کی روح میں نہیں ہے۔ اور اس کے نشہ کی تہ میں ایک ایسی بیداری ہے جسے ہوشیار اور باخبر لوگ نہیں جانتے!

سلیم تتال کی سب سے بڑی خوبی —— جو مجھے معلوم ہوئی —— یہ ہے کہ وہ گھنٹوں سورج کو جاں نگاہوں سے تکتا رہتا ہے۔ گویا وہ شیشہ کی ہیں۔ نہ اس کی پلکیں جھپکتی ہیں، نہ آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہوتی ہے! میں نے کئی بار چاہا کہ اس عجیب عادت سے اسے روکوں اور ڈرایا کہ اگر وہ اپنی اس حرکت سے باز نہ آیا، تو بصارت سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ لیکن اس نے ہر بار یہی جواب دیا:

"چھچھوندر زمین کی تاریکیوں میں اپنے دن گزارتی ہے اور عقاب آفتاب سے آنکھیں لڑا کر اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن کیا تم نے اپنی عمر میں کسی عقاب کو اندھا دیکھا ہے؟!"

تین برس گزر گئے اور سلیم مجھے نظر نہ آیا۔ مجھ میں اور میرے دوستوں میں اکثر اس کا ذکر رہتا۔ ہم کبھی از راہ تفنن اس کی عجیب و غریب حرکات پر ہنستے اور کبھی اس کی فطری صلاحیتوں اور غیر معمولی علم پہ

اظہارِ تعجب کرتے۔ ہم نے بہت معلوم کرنا چاہا کہ اس پر کیا بیتی؟ لیکن ہمیں کوئی ایسا شخص نہ ملا، جو اس کے متعلق کچھ جانتا ہو۔

ایک ہفتہ کی بات ہے: میں تنہا بیٹھا تھا، میرے کان رات کی آوازوں پر لگے تھے اور ذہن اسرارِ شب کی پردہ کشائی میں مصروف تھا۔ اتنے میں کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا، تو سلیم میرے سامنے کھڑا تھا: کپڑے پھٹے ہوئے، بال الجھے ہوئے اور چہرہ پر ہوائیاں اڑی ہوئیں۔ خوشی خوشی میں اسے گھر میں لے گیا، لیکن اُس کی یہ زدہ حالت دیکھ کر مجھے سخت حیرانی تھی۔ بہر حال میں نے اسے سامنے بٹھایا، پہلے مزاج پوچھا، اس کے بعد ان دنوں کے واقعات دریافت کرنے لگا، جو اس نے اپنے عزیزوں اور دوستوں سے دور رہ کر بسر کئے تھے۔ وہ کبھی میری آواز سے چونک پڑتا اور کبھی مجھے اس طرح دیکھنے لگتا، گویا میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی۔

میں نے اسے شراب کا ایک جام پلایا اور یہ ظاہر کرنے کے بعد کہ مجھے اس سے کتنی محبت ہے، میں اس کی موجودگی میں اپنے لئے کتنی راحت پاتا ہوں، اس سے پوچھا:

"سلیم! تم پر کیا بیتی؟ کہیں تم وہ سارا مال اور وہ ساری جائیداد تو نہیں گنوا بیٹھے، جو تمہیں اپنے باپ سے ورثہ میں ملی تھی؟"

اس برقی قمقمے پر نگاہیں جمائے ہوئے، جو اس کی کرسی کے قریب آویزاں تھا، اس نے جواب دیا:

"میری سمجھ میں نہیں آتا، اس قسم کا مہمل سوال تم مجھ سے کیوں کر رہے ہو؟ میں نے نہ کوئی مال گنوایا، نہ جائیداد کھوئی۔ جو کچھ میرے باپ نے چھوڑا تھا، وہ جوں کا توں موجود ہے۔"

اس کے بعد مسکرا کر کہنے لگا:

"بلکہ کل ہی وکیلوں اور بنک والوں کی طرف سے مجھے اطلاع ملی ہے کہ والد نے مرتے وقت، جو دولت میرے لئے چھوڑی تھی، وہ اب دوگنی ہو گئی ہے!"

اس کے کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، میں نے طنزیہ لہجہ میں کہا:

"اچھا! تو جبھی تم ان کپڑوں میں لپٹے ہوئے ہو کہ اگر کوئی تمہیں دیکھے، تو اُن بھک منگے فقیروں میں کا کوئی فقیر سمجھے، جو ہاتھوں میں

چوبی کشکول لئے، لمبے عصا کے سہارے، زمین کا گز بنے پھرتے ہیں۔"

اس نے جواب دیا:

"کوئی انسان نہیں ہے، جو کسی نہ کسی چادر میں لپٹا نہ ہو اور کوئی انسان نہیں ہے، جو کسی نہ کسی چیز کی بھیک نہ مانگتا ہو!"

اس کے ان فقروں پر متعجب ہوتے ہوئے، میں نے کہا:

"بہت خوب! لیکن تم ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ ہو۔ اور تمھارا فرض ہے کہ اپنے خاندان کے وقار کی حفاظت کرو۔ تمھاری ظاہری حالت اپنی خاندانی عظمت کے شایانِ شان ہونی ہی چاہیئے!"

پر سکون لہجہ میں اس نے جواب دیا:

"میں مصروف تھا، میرے بھائی! میں مصروف تھا اور میرے پاس اتنا وقت ہی نہ تھا کہ میں اس قسم کی باتوں پر غور کرتا۔ میں ایک ایسے کام میں مصروف تھا، جو کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کے مسائل سے کہیں زیادہ اہم ہے!"

اس کے چہرہ پہ گہری فکر کے آثار نمایاں ہو گئے۔ لیکن اس کی آنکھیں برتی قمقمے پہ جمی رہیں۔ آخر میں نے اس سے پوچھا:

"تم کس کام میں مشغول تھے؟ تسلیم! وہ ایسی کون سی مصروفیت تھی جس نے تمھیں اور تمام کاموں سے بے خبر کر رکھا تھا؟"

میری طرف متوجہ ہو کر اس نے جواب دیا:

"میں اس پردہ کو چاک کرنے میں مصروف تھا، جو میرے حافظہ پر پڑا ہوا تھا۔ میں اپنے حافظہ کی کانیں کھودنے میں مصروف تھا۔ میں زمانہ کی اس کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھا، جسے ہم حافظہ کہتے ہیں۔"

یہ الفاظ اس کی زبان سے اس طرح ادا ہوئے، جیسے دُور ــــ بہت دُور خالی وادیوں میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ اس کے بعد اس نے میری طرف سے نگاہیں پھیر لیں اور پھر اسی برقی قمقمے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ پہلی بار ــــــ اپنے اور اس کے زمانۂ تعارف میں پہلی بار، میں نے محسوس کیا کہ اس کی روح کے کسے ہوئے تار ذرا ڈھیلے پڑے ہیں۔ اس کے باطن کی کشمکش اور بے چینی نے قدرے سکون و اطمینان کی صورت اختیار کی ہے۔ اس کے پیالے میں دوبارہ شراب انڈیلتے ہوئے، میں نے سوال کیا:

"حافظہ کی کانوں اور زمانہ کی اس کتاب سے، جسے ہم حافظہ کہتے ہیں، تمھاری کیا مراد ہے؟ یہ نئی اور انوکھی فکر کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا:

"میں نہیں جانتا: تم مجھے کتنا سمجھ سکتے ہو، یا کتنا سمجھنا چاہتے ہو؟ میں خواہ مخواہ ان لوگوں کے سامنے اپنی روح کو پیش کرنے لگتا ہوں، جو روحانیت سے بیگانہ ہیں۔ فضول ان لوگوں کے سامنے اپنی ذات کی تہیں کھولنے لگتا ہوں، جو خود اپنی ہی ذات سے ناآشنا ہیں۔"

میں نے کہا:

"سلیم! میں تمھیں سمجھنا چاہتا ہوں اور اگر مجھے اپنے اس ارادہ میں کامیابی نہ ہوئی، تو یقین رکھو! میں اپنے عجز کا اعتراف کر لوں گا!"

وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔ اس کے بعد شراب کا ایک گھونٹ پیا اور کہنے لگا:

"اچھا، تو سنو! اپنے کانوں سے پہلے اپنے دل سے سنو! کبھی تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ اپنی پیدائش سے پہلے بھی تم ایک صاحب ادراک ہستی کی حیثیت سے موجود تھے؟

میری روح اس کے اس سوال سے لرز اٹھی اور میں نے جواب دیا:

"ہاں! میں نے بارہا اس کے متعلق سوچا ہے۔ لیکن ہر بار میری مثال اس شخص کی سی ہوئی ہے، جو کسی پرانے شاہ بلوط کے درخت کی جڑ کو اکھاڑنے کے لئے، اس سے چمٹا ہو۔"

اس نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا:

کبھی تم نے مرئیات کی طرف سے اپنی آنکھیں اور آوازوں کی طرف سے اپنے کان بند کئے ہیں؟ کبھی تم نے اپنے حواس کو زندگی کے سطحی پہلوؤں پر عمل کرنے سے روکا ہے؟ تاکہ تم حافظہ کی مدد سے اس حالت کی طرف لوٹ سکو، جس میں تم انسان بننے سے پہلے تھے؟"

میں نے کہا:

"نہیں! میں نے ایسا کبھی نہیں کیا!"

وہ بولا:

"لیکن میں نے ایسا کیا ہے! میں اپنی ذات کی گہرائیوں کا کھوج لگانے کے لئے انسانی راہوں سے ہٹا ہوں۔ میں نے اپنی بصیرت

کے سامنے وہ خاکے پھیلائے ہیں، جو میرے حافظہ نے اس حالت سے اخذ کر کے اپنی تہوں میں رکھ لئے تھے، جس حالت میں، اس ذہن پہ نازل ہونے سے پہلے، میں تھا۔"

میں نے پوچھا:

"پھر تم اپنے مقصد کو پہنچ گئے؟ کیا تم نے وجود قبل از وجود کے خاکے اپنے حافظہ کے جیب و دامن میں پا لئے؟"

اس نے جواب دیا:

"ہاں! میں اپنے مقصد کو پہنچ گیا۔ حافظہ زمانوں کی امانت گاہ ہے اور ہم میں سے ہر شخص اس امانت گاہ میں داخل ہو کر وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے، جو زمانوں نے اس خزانہ کے گوشوں اور خلاؤں میں جمع کر رکھا ہے! حافظہ ایک بے شمار پتیوں والا پھول ہے۔ ہم اگر چاہیں تو مسلسل فکر اور نفسی سپردگی کے پردوں سے ان پتیوں کا طواف کر سکتے ہیں۔ تا آں کہ وہ ہماری سوجھ بوجھ کی گرمی سے شگفتہ ہو جائیں۔ جس طرح سورج کی کرنیں گلاب کی پتیوں کو چومتی ہیں اور وہ ان کی حرارت سے کھل جاتی ہیں۔"

وہ تھوڑی کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تبسم نمودار ہوا، جو مسرت سے زیادہ الم سے قریب تھا۔ اس نے کہا:

"برسوں سے تم مجھے "سودائی" کہہ رہے ہو! بلاشبہ تم نے میری حقیقت کو پا لیا ہے اور تم میری حالت کو صحیح سمجھتے ہو۔ میں آج بھی ان تصویروں اور پرچھائیوں کے درمیان، جنھیں ہم زندگی کہتے ہیں، کھویا ہوا ہوں۔ اور وہ کون سا انسان ہے، جو یہ دیکھ کر گم نہ ہو جائے کہ اس کی حیاتِ معنوی دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک حصہ وہ عالم غیب میں بسر کر رہا ہے اور دوسرا حصہ اس قیاس و مقدار کی دنیا میں گزار رہا ہے۔ وہ کون سا انسان ہے، جو یہ محسوس کر کے آہیں نہ بھرنے لگے کہ اس کی روح دو جذبوں کی کھینچا تانی میں ہے: ایک چھپا ہوا جذبہ اور ایک کھلا ہوا جذبہ! وہ کون سا انسان ہے، جو دو مختلف سُر کے نغموں کو اپنے کانوں میں سمو سکے: ایک اپنھر کی گہرائیوں سے اُترتا ہوا نغمہ اور دوسرا زمین کی گہرائیوں سے اُبھرتا ہوا نغمہ!!

ہاں! میں گم گشتہ تھا اور گم گشتہ ہوں۔ لیکن آج میں وہ کچھ جانتا

ہوں، جو اپنی جوانی میں نہیں جانتا تھا۔ میں نے تین برس اپنے حافظہ کے سبزہ زاروں کا طواف کیا ہے اور جان لیا ہے کہ ہونے سے پہلے میں کیا تھا؟ وجود میں آنے سے پہلے میں کیسا تھا؟ اس سے پہلے کہ میری ماں مجھے جنم دے، میری نفسی حالت کیا تھی؟ اور اس سے پہلے کہ میری روح اس جسم کو اپنا غلاف بنائے، اس کی کیفیت کیا تھی؟ میں نے اپنا سرچشمہ معلوم کر لیا، اور میں مطمئن ہوں کہ میرے حافظہ میں وہ چیز ہے، جو میرے مرکز کو ثابت کرتی ہے۔"

اس نے اپنا سر سینہ کی طرف جھکا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا اترا ہوا چہرہ ہاتھی دانت کی ایک مورتی معلوم ہو رہا تھا، جو کسی ماہر سنگ تراش نے کسی نصرانی شہید کی یادگار کے طور پر بنائی ہو۔ میں اس کی کرسی سے ذرا اور قریب ہو گیا، اور اس ڈر سے کہ میری بلند آواز اس کے خیالات کا سلسلہ منتشر نہ کر دے، سرگوشی کے لہجہ میں کہا:

"مجھے بتاؤ! سلیم! وہ سب کچھ مجھے بتاؤ! جو تم نے اپنے حافظہ سے حاصل کیا ہے۔ میرے کان سماعت کی پوری قوتوں کے ساتھ تمھاری طرف لگے ہیں۔"

اس نے اپنا سر اُٹھایا اور آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا:

"مجھے یاد ہے کہ میں فضا میں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں خلا میں منڈلاتا پھر رہا تھا۔ کبھی اڑ جاتا، کبھی اُتر آتا......... میں ہوا کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ جب وہ ٹھہرتی، تو میں بھی ٹھہر جاتا۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں ایک ہی وقت میں ہر جگہ ہوں اور ایک ہی جگہ ہر وقت میں۔ میں سورج کی کرنوں میں تھا۔ نہیں! بلکہ میں خود ہی کرنیں تھا۔ میں نہیں جانتا کہ میں ایتھر کا ایک ذرّہ تھا، یا پورا ایتھر مجھے معلوم نہیں کہ میں زندگی کی خواہشوں اور کشمکشوں کا ایک جزو تھا، یا خود ہی زندگی کی ہر خواہش اور ہر کشمکش!......... میں اپنے آپ سے کہتا تھا: "میں۔ میں ہوں!" لیکن اس "میں" سے اس وقت وہ چیز مراد نہ تھی، جو لکیروں، رنگوں اور ذاتی و انفرادی خصوصیات میں محدود ہوتی ہے ——— نہیں: میں ایک فرد نہ تھا، میں ایک ذرّہ نہ تھا، میں ایک جزو نہ تھا، میں ایک عنصر نہ تھا، جو اپنی وحدانیت کی بنا پر، ان عناصر سے الگ ہوتا ہے، جن کی اپنی اپنی وحدانیت انہیں ایک دوسرے سے منفرد رکھتی ہے۔ بلکہ میں تمام عناصر کا مجموعہ تھا، جو

آپس میں مل کر ایک ہو گئے تھے۔ یہ عناصر ایک مقناطیسی قوت سے چمٹے ہوئے تھے، جس کی تعریف میں اپنے اس قول کے سوا کہ " میں۔ میں ہوں!" اور کچھ نہیں کر سکتا .... میں ماضی میں یہ کچھ تھا ــــ میں نے ماضی کہا ہے اور یہ، وہ مبہم کلمہ ہے، جس کے معنی میں پورے طور پر نہیں جانتا۔ کبھی ماضی، حال اور مستقبل بن جاتا ہے اور کبھی وہاں ماضی، حال اور مستقبل سرے سے ہوتے ہی نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ جسے ہم " زمانہ " کے نام سے پکارتے ہیں۔ میں اسے نہیں جانتا، جس طرح میں " مکان " کے معنی نہیں سمجھتا۔ میں جب کبھی ان دو لفظوں ــــ زمان و مکان ــــ کے متعلق سوچتا ہوں تو بڑی مشکل میں پڑ جاتا ہوں۔ میری ذات خود اپنے متعلق شبہ میں مبتلا ہو جاتی ہے اور میری فکر دُل بادل دُھند کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جو ٹیلوں اور گھاٹیوں میں رواں دواں ہو .... لیکن جو بات مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ یہ ہے کہ پہلے میں ایک حالت میں تھا اور بعد کو دوسری حالت میں آ گیا۔ میں بڑا تھا، چھوٹا ہو گیا۔ فراخ تھا، تنگ ہو گیا۔ بے آغاز و بے انجام تھا، ابتدا و انتہا میں محدود ہو گیا۔ میں ایک قوت تھا، جو اپنے

نفس کا عرفان رکھتی تھی اور ایک کمزوری ہوگیا، جو اپنے نفس کی معرفت کو ترستی ہے۔ میں ایک روح تھا، جو ہر سطح پر منڈلاتی اور ہر چیز میں در آتی تھی اور جسم ہوگیا، جو آہستہ آہستہ رینگتا ہے اور اپنے ہاتھ پاؤں کو اس طرح گھسیٹتا ہے، گویا بھاری زنجیریں ہیں .... "میں تھا اور ہوگیا"۔ "میں تھا اور ہوگیا"۔ "میں تھا اور ہوگیا" یہ الفاظ میں دہراتا رہا۔ یہاں تک کہ میرا اپنے وجدان سے وہی رشتہ ہوگیا، جو رشتہ ڈوری سے اس کے دونوں سروں کا ہوتا ہے۔

بیس برس سے میں لگاتار اپنی عقلی قوتیں صرف کر رہا ہوں۔ اس اُمید میں کہ شاید اس ہستی کے اس ہستی میں تبدیل ہونے کی کیفیت معلوم کر لوں۔ لیکن ابھی تک میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوا۔ اور میرا خیال ہے: آئندہ بھی کامیاب نہیں ہو سکوں گا۔ تاہم ایک چیز —— جو بیک وقت واضح بھی ہے اور مبہم بھی —— مجھے یاد ہے اور وہ یہ کہ جب میں ایتھر تھا، تو کسی ایک زمانہ میں مجھے ایک ہولناک حادثہ پیش آیا۔ میرے باطن میں —— میرے محیط میں —— اُس عالم میں، جسے "میں" میں۔ "میں ہوں!" کہہ کر پکارتا تھا، ایک گولا سا پھٹا اور

وہ سارا عالم ایک جوش کھاتی، ایک اُبلتی ہنڈیا میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے بعد اُس میں ایک ہنگامہ بپا ہُوا، ایک تہ و بالا کر دینے والی بھیانک آندھی اُٹھی، جس کے جھکڑوں نے میری ہستی کے ہر سکون کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ وہ اطمینان، جو میرا مالک تھا اور جس کا میں مالک تھا، دفعتہً ایک خوفناک گرج سے بدل گیا اور وہ سلامتی، جو مجھ سے ہمکنار تھی اور جس سے میں ہمکنار تھا، چمکتی بجلی بن گئی۔ وہ معرفت —— وُہ ہمہ گیر معرفت، جو ہر چیز کو سینہ سے لگاتی ہے —— وہ غیر محدُود معرفت، جو ہر چیز کے بھیدوں اور باریکیوں کو واضح کرتی ہے، دُوسری پریشانی میں گھر گئی —— ایک پریشانی پر دوسری پریشانی۔ اور وہ سماوی راز —— وہ راز، جو میری گہرائیوں میں جولاں کار تھا، بے شمار درد کی ماری عورتوں کی طرح چیخنے، لاتعداد بھوکے شیروں کی طرح دہاڑنے اور اَن گنت تانبے کی گھنٹیوں کی طرح شور مچانے لگا .... یہ طوفان نہ معلوم کتنی دیر تک رہا۔ ہو سکتا ہے: ایک منٹ رہا ہو اور ہو سکتا ہے: پُورا زمانہ اس میں صرف ہو گیا ہو .... اس کے بعد ہر حرکت ٹھہر گئی، ہر آواز خاموش اور ہر پریشانی جامد ہو گئی۔ اب میں

ساکن تھا۔ لیکن میرا یہ سکون، اس شخص کا سا سکون تھا، جسے چاروں طرف سے بھینچ لیا گیا ہو۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ میں نے اس حالت کے تمام تر دباؤ اور تنگی کے باوجود، اپنے تئیں اس کے حوالے کر دیا۔۔۔۔۔۔ اس کے بعد میں نے ایک بوجھل اور زبردست اونگھ محسوس کی اور پھر گہری تاریکی میں گہری نیند سو گیا۔"

یہ کہہ کر سلیم خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرہ پر ماندگی اور تکان کے آثار نمایاں تھے۔ ہانپتے ہوئے اس نے اپنا سر کرسی کی پشت سے لگا لیا، جیسے کوئی گھوڑا، دوڑ کے بعد ہانپتا ہے۔ اس کے بعد اُس نے میری طرف ان نگاہوں سے دیکھا، جن سے لطیف شعاعیں پھوٹ رہی تھیں

"اس کے بعد ——— اُس طوفان اور اس سکوت کے بعد ——— بوجھل اونگھ اور گہری نیند کے بعد ——— میں بیدار ہوا۔ لیکن میری بیداری اس مخمور کی بیداری تھی، جس کے وجدان پر ہوش میں آنے کے بعد بھی بے ہوشی کا پردہ پڑا ہو۔ میں نے خود کو ایک ناتواں بچہ پایا، جو ایک عورت کی گود میں تھا۔ وہ عورت آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے دیکھ رہی تھی اور ایک مہربان و شیریں مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس کے فضائی سفر نے اس کی روح اور جسم کو نڈھال کر دیا ہے اور کہا:

"بس کرو! بھائی! بس کرو!! تم نے میرے سامنے وہ باتیں بیان کی ہیں، جو آج تک کوئی انسان نہیں کر سکا۔ بس اب کچھ نہ کہو! تمھیں اس وقت آرام کرنے کی ضرورت ہے۔"

اس نے کہا:

"میرے پاس کہنے کے لئے اب رہ بھی کیا گیا ہے! جو کچھ مجھے یاد تھا، جو کچھ میں نے جانا تھا، وہ سب تمھارے سامنے رکھ دیا۔ لیکن اب بھی میں اپنے علم اور اپنی یاد کے درمیان کھویا ہوا ہوں —— ہاں! میں اب بھی کھویا ہوا ہوں، میں اب بھی کھویا ہوا ہوں۔"

ایک گھنٹہ گزر گیا اور ہم دونوں میں سے کسی نے کوئی بات نہ کی۔ وہ وقت اور اس کی تاثیر، میں جیتے جی نہیں بھول سکتا۔ اس لئے کہ اس نے میری روح میں ایک نیا احساس جگایا، میرے دل میں پرانی شراب انڈیلی اور میرے افکار کو سنہری لباس پہنایا۔"

آدھی رات ہونے پر سلیم کھڑا ہوا اور کہنے لگا:

"ہم بہت دیر جاگے۔ اب میں چلتا ہوں؟"

میں نے کہا:

"میرے بھائی! اب نہ جاؤ! آج کی رات میرے مہمان رہو!"

اس نے جواب دیا:

"نہیں، نہیں!! میں ایسے گھر میں نہیں ٹھہر سکتا، جس کی فضا میں آوازیں کانپ رہی ہوں اور گوشوں میں سائے رینگ رہے ہوں۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا دروازہ کی طرف چلا اور اتنی تیزی سے نکل گیا، جیسے کوئی جلتے مکان سے بھاگ کر نکلتا ہے۔

اس وقت سے لے کر آج تک، جب بھی مجھے سلیم کا خیال آتا ہے۔ میری فکر ہر اس پیمانہ کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے، جو زمانہ کو شب و روز میں تقسیم کرتا ہے، جب بھی اس کی باتیں یاد کرتا ہوں، ہر اس انتہا سے کنارہ کش ہو جاتا ہوں، جو مقام کو دائیں اور بائیں سمتوں میں محدود کرتا ہے۔ جب بھی اس کا چہرہ اور اس کی آواز کا ترنم یاد آتا ہے، میری عقل ہستی کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں میں گم ہو جاتی ہے۔

نہیں! میں نے سلیم سا آدمی دیکھا ہے، نہ کبھی دیکھوں گا۔ وہ لوگوں میں ہے، لیکن لوگوں میں سے نہیں ہے۔ دنیا میں ہے، لیکن دنیا والوں میں سے نہیں ہے۔ میں نے بارہا اپنے آپ سے پوچھا ہے کہ میں سلیم کے ساتھ چند گھنٹے اس کمرہ میں جاگا ہوں؛ یا میں نے اس کے ہمراہ فضائی طبقات میں ایک صدی بسر کی ہے؟ میں نے بارہا اپنے حافظہ سے وضاحت چاہی ہے کہ میں اس سے بیداری میں ملا تھا، یا خواب میں؟

مگر ہاں! انوکھی حقیقتیں ہم پر بیداری ہی میں ظاہر ہوتی ہیں اور سلیم بلاشبہ ایک انوکھی حقیقت ہے!

شاعر

(عورتیں اس سے محبّت کیوں کرتی ہیں؟)

"اچھی طرح کان کھول کے سن لے! لڑکی! اگر تو نے اپنے نفس کو دُنیا کی سب سے پست، سب سے حقیر چیز نہ سمجھا، تو ہم اسے قتل کر دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اپنے رسم و رواج کے خلاف زندگی بسر کرنا، ہمارے لئے ناممکن ہے ——— مت رو! بیٹی!"

یہ ان بزرگوں نے ارشاد فرمایا، جو اس سے محبّت کرتے تھے، اس پر جان چھڑکتے تھے اور اس کے بعد ہی سے اس کے نفس کو کچھ کے

دینے اور کچلنے لگے حالانکہ انھیں اپنی اس حرکت پر افسوس تھا اور وہ اس عجیب و لطیف نفس کی تباہی پر کڑھتے تھے، جو آنسوؤں سے بھیگی وادیٔ حیات میں آلودہ ہونے کے لئے پیدا نہیں کیا گیا تھا۔

لڑکی نے پوچھا:

"نفس مجھ میں کیوں نہیں ہونا چاہیئے؟ آخر معدہ، جگر اور دوسرے اعضا بھی تو ہیں!"

——"یہاں فلسفہ سے کام نہیں چلے گا؟ بیٹی! نہ فلسفہ کو اس مسئلہ سے کوئی تعلق ہے۔ نفس یا ملکہ کے لئے ہوتا ہے، یا بھکارن کے لئے! درمیانی طبقہ اس نعمت سے محروم رکھا گیا ہے اور یہ وہ حقیقت ہے، جسے دُنیا جانتی ہے——شاید تو اپنے تئیں ملکہ سمجھتی ہے؟!"

لڑکی کو پورا یقین تھا کہ نہ وہ ملکہ ہے، نہ کبھی ہو سکتی ہے، اس لئے مکمل آمادگی کے ساتھ اپنے نفس سے دست بردار ہو گئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں اپنے نفس کی قیمت گرائی اور اسے ان لوگوں کے حوالے کر دیا۔

وہ بڑی دیر تک گم صُم بیٹھی رہی——چہرہ زرد اور جسم

بھوک سے نڈھال خون کے قطرے، اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ٹھنڈی چسکیوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ اور احساس بے چارگی ایک کپکپی، ایک ہلاکت کی صورت میں اس پہ طاری تھا۔ اس نے سوچا:

"پہلے بھی میں کچھ نہ تھی؟ اور اب بھی کچھ نہیں!"

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے محسوس کیا کہ نفس کے بغیر اس کی زندگی بوجھل ہو گئی ہے اور وہ اپنے نفس کو ڈھونڈنے چلی۔

پہلے وہ گوہ کے پاس گئی اور اس سے پوچھا:

"میرا نفس تیرے پاس تو نہیں ہے؟"

گوہ نے اپنی زبان میں جواب دیا:

"نہیں! میرے پاس تو بس اپنا میلا کچیلا نفس ہے!"

اسی طرح وہ بہت سے لوگوں اور بہت سی چیزوں کے پاس گئی۔ لیکن اس نے جس سے پوچھا اس کے پاس بس اس کا اپنا ہی نفس تھا۔ آخرکار وہ شاعر کے پاس گئی جو دنیا سے الگ، ایک تنہا مقام پہ رہتا تھا اور اس سے پوچھا:

"تمھارے پاس تو میرا نفس نہیں ہے، جو میں نے زندگی میں کھو دیا

ہے!"

شاعر نے انتہائی لطف و مہربانی کے لہجہ میں جواب دیا:

"میں ان تمام نفوس کو اپنے باطن میں محفوظ رکھتا ہوں، جو زندگی میں تباہ ہوجاتے ہیں، جنھیں مصیبتیں اور دھڑکے چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں، جن میں اتنی سکت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے دل میں اُمیدوں اور آرزوؤں کے غنچے کھلا سکیں اور وہ وقت سے پہلے مر جاتے ہیں۔ میں تمام پِسے اور ٹوٹے ہوئے نفوس کے لئے ایک ابدی امانت خانہ ہوں، جہاں یہ نفوس اپنی باقی ماندہ زندگی پوری کرتے ہیں۔ ان نفوس میں ننگ و ذلّت کی ماری بیسوا کا نفس بھی ہے اور ادنیٰ طبقہ کی حسّاس لڑکی کا نفس بھی۔ محبّت کی ستائی دوشیزہ کا نفس بھی ہے اور جدائی کا تیر کھائی حسینہ کا نفس بھی۔ بڑھیا عورت کا نفس بھی ہے اور اپاہج عورت کا نفس بھی۔ فریب کھائی ہوئی عورت کا نفس بھی ہے اور بیماری کی تکلیفوں سے کراہتی ہوئی عورت کا نفس بھی ـــــــ حسین و جمیل نفس بھی ہے اور بدصورت و بدنام نفس بھی۔ فضائے عالم میں صنفِ نازک کے نفوس کا ایک ذرّہ بھی ضائع نہیں ہوتا۔ جہاں زندگی میں کوئی نفس تباہ ہونا شروع

ہُوا اللہ نے اسی وقت اس کو شاعر کے نفس میں رکھ دیا کہ وہ اپنے حسن و رعنائی کی تمام لطافتوں کے ساتھ نمو پائے، اس میں پھول آئیں اور وہ اپنی اس انتہا کو پہنچ جائے جو حسن کا نقطۂ آخر ہے۔

ہاں! کائنات میں کوئی شے ضائع نہیں ہوتی؟ بیٹی! دیکھ! یہ تیرا نفس میرے اندر آسودگی پا رہا ہے اور پروان چڑھ رہا ہے اس میں پھول کھل رہے ہیں اور وہ ملکہ کے نفس کی طرح حسین و دلفریب ہے!"

لڑکی نے فوراً اپنے نفس کو پہچان لیا اور دیکھا کہ وہ حسین و بے نیاز ہو گیا ہے۔ شاعر نے اس سے کہا:

"جا؟ بیٹی! میں یہ نفس تجھے بخشتا ہوں؟ کیونکہ یہ تیرا اپنا ہی نفس ہے!"

لڑکی نے کہا:

"نہیں! اسے اپنے ہی پاس رہنے دو! یہاں یہ سب جگہ سے زیادہ محفوظ ہے۔ اسے اپنے ہی نفس میں راحت پانے دو! تم میری بجائے اور میرے لئے خواب دیکھو گے، سوچو گے اور آنسو بہاؤ گے۔

اب میں زندہ رہ سکتی ہوں، اپنے نصیب کی مصیبتیں جھیل سکتی ہوں میں تمہارے ——— نہیں! میرا مطلب ہے: اپنے ——— نفس کو دیکھنے اتوار کے دن آیا کروں گی اور اس وقت پہلے جیسی ہو جاؤنگی ——— ہاں! اس وقت میں "حقیقی" ہو جاؤں گی"

شاعر نے بہ کمال شفقت و ہمدردی کہا:

"اچھا! تم اتوار کے اتوار آجایا کرنا!!"

اور وہ اتوار کے اتوار ——— فرصت و فراغت کی گھڑیوں میں ——— وہاں جاتی اور اپنے نفس کی طرف رجوع ہوتی ——— اپنے خوابوں اور امیدوں کی طرف، اپنے دکھوں اور آنسوؤں کی طرف!! اپنے حقیقی نفس کی طرف!!!

وہ سوچتی اور کہتی:

"اے دور تک مستقبل کو نہ دیکھنے والے عزیزو اور دوستو! کتنے احمق ہو تم! میں نے تمہاری خاطر اپنے نفس کو چھوڑ دیا، ایسی حالت میں کہ وہ چھوٹا بھی تھا اور کمزور بھی۔ لیکن دیکھو! اب وہی نفس شاعر کے باطن میں پھل پھول کے بڑا اور طاقت ور ہو گیا ہے۔ اور وہیں سے تم پر خوف و

رعب طاری کر رہا ہے۔ تم نے جس چیز کو میرے باطن میں موت کے گھاٹ اُتارا، شاعر نے اس کی تمام رعنائی اور قوت نمو کے ساتھ اسے محفوظ کر لیا اور جیسا کہ قدیم اساطیر میں ہے کہ خوفناک اژدھے کے کٹے ہوئے ایک پھن سے سینکڑوں پھن جنم لیتے ہیں، اسی طرح اب ہمارے ٹوٹے ہوئے دل شاعر کے نفس میں انوکھی طرز سے نمو پا رہے ہیں، ان میں پھول مسکرا رہے ہیں اور وہ بڑے ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ اللہ نفوس کائنات کے ذرّوں کو اسی ذریعہ سے محفوظ کرتا ہے۔

اس طرح شاعر اپنے غمزدہ رشتہ داروں اور اس قوم کے بدبختوں کا انتقام لیتا ہے، جسے اس کے بھائیوں نے قتل کر دیا ہو۔

"اے شاعر! اے ہمارا انتقام لینے والے! اے ہمارے نفوس کے وکیل اور محافظ! ہم تجھ سے محبت کرتے ہیں!!"

زندگی

ابنِ صحرا نے ایک خواب دیکھا ـــــ عجیب اور حیرت ناک خواب ـــــ جو عام خوابوں سے مختلف اور کبھی اس کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آیا تھا ـــــ بلکہ ایسا خواب، جس کا تصوّر وہ بیداری میں بھی نہ کر سکتا تھا، جس پہ اس کا ادراک ہوش کے عالم میں بھی دسترس نہ پا سکتا تھا۔

اس نے دیکھا: بحرِ روم فضا کی لامحدود وسعتوں میں پھیلا ہوا ہے، اس کے کنارے نگاہوں سے اوجھل اور اس کی موجیں سکون سے بکھر

محروم ہیں۔ برہنہ شام کے ریگ زار، جلتے ہوئے افریقہ اور ابھرتے ہوئے یورپ کے ساحل تین مختلف سمتوں سے اس باجبروت سمندر کو تک رہے ہیں۔ جو اپنے ساکنین کو، ان کے مختلف النسل اور مختلف المذاہب ہونے کے باوجود اپنے بچوں کی طرح پال رہا ہے۔

ابن صحرا نے آبادی کے ایک گوشہ پہ نگاہیں گاڑ دیں اور دیکھا کہ قدیم مصر —— فراعنہ کا مسکن —— سمندر سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔ اس کے اہرام آسمان کا سینہ چھید رہے ہیں اور اس کے عجائبات عزت و اقتدار کے صولجان اور سیادت و بقا کے تاج کے لئے دُنیا سے چھید آبجیھی کر رہے ہیں۔ عظمت و منزلت کا دیوتا نیل اسے سیراب کر رہا ہے اور اس کی گود نعمتوں اور من بھاتی چیزوں سے بھر رہا ہے اس کے علاوہ وہاں وہ وہ نوادر اور وہ وہ انوکھے اسرار ہیں، جنھیں سمجھنے کی دُنیا نے بہتیری کوشش کی، لیکن برس ہا برس کی محنتوں کے بعد بھی صرف چند اسرار کے چہرے سے نقاب اُٹھائی جا سکی۔ مصر اپنے ان عجائبات و نوادر کے درمیان لیٹا، اونگھ رہا ہے اور سکون کی آغوش میں اس طرح بے حس و حرکت پڑا ہے، گویا سحر و طلسمات نے، اس کی کسی

مشہور ممی کی طرح، اسے بھی حنوط شدہ لاش بنا دیا ہے۔

دوسری طرف اسے یونان نظر آیا اور مجمع الجزائر بھی، جسے دریا کے جنگلوں، گنجان باغوں اور انگور کی سرسبز و خوش نما بیلوں نے اس طرح گھیر رکھا تھا، جیسے چاند کے گرد ہالا۔ اس کے اکثر شہروں میں سنگ مرمر کے سفید براق ستون اور دیوتاؤں کی مورتیاں اپنے تمام تر حسن کارانہ کٹاؤ اور دلکش نقش و نگار سمیت نظر فریب چبوتروں پر ایک عجیب ادائے غرور اور انوکھی شان بے نیازی کے ساتھ جلوہ فرما تھیں۔ میدان اور ٹیلے لوگوں سے پٹے پڑے تھے وادیوں اور سبزہ زاروں میں انسانی ٹولیاں اِدھر اُدھر منڈلاتی پھر رہی تھیں اور لوگوں کے ہجوم میں اپنی دیو داسیاں اپنے بال بکھیرے ہر سمت نگاہوں کے تیر چلا رہی تھیں۔ زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ انھوں نے عود و رباب، دف و چنگ سنکھ اور دوسرے آلاتِ طرب اُٹھائے اور انھیں بجانے لگیں سمندر کی موجیں حرکت سے سکون میں آگئیں چٹانیں اور درخت اُن دلآویز نغموں کی لے پر رقص کرنے لگے، جو دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں ایک طرف یہ سب کچھ تھا اور دوسری طرف کشتیاں، شہد کی مکھیوں کی طرح، مجمع جزائر کے چاروں طرف ہجوم کرتیں اور پھر منتشر ہو کر

اپنے مختلف رنگ کے بادبان ہوا میں لہرا دیتیں۔

لیکن یہ سب ہنگامہ سکون سے بدل گیا اس نے خاموشی سے ناتا جوڑ لیا اور عظمت و وقار سے مفتخر ہو گیا۔

روم ——— عروس البلاد روم ——— وہ آہنی شہر روم، جس نے سب کی طرف اپنے نیزوں کی انی کا رُخ کیا اپنی تلواروں کے فولاد سے فضاء کا سینہ چھیدا اور اپنے بڑے بڑے بازوؤں کو پھیلاتے ہوئے ہر سمت رشک و حسد کی نگاہ ڈالی لیکن سکون و سکوت کی آغوش میں پہنچنے میں وہ بھی کسی سے پیچھے نہ رہا اور اس کے جبروتی اعضائیں سے کوئی چیز حرکت کرنے کے قابل نہیں رہی۔

سماوی اوقیانوس کی تمام ہوائیں، جو ایک مدت سے اُٹھ رہی تھیں، جوش میں آ رہی تھیں اور دنیا کے اطراف واکناف کا طواف کر رہی تھیں، خاموش ہو گئیں اور عظمت و جبروت کا دیوتا بحرِ روم جس کی موجیں ہمہ دم متلاطم رہتی تھیں، خاموش و مطمئن ہو گیا۔

غریب ابن صحرا حیرت و درماندگی کی تصویر بن کر رہ گیا آخر بڑی دیر کی ذہنی کشمکش کے بعد اس نے خیال کیا کہ ربع مسکون کے تمام

حیوانات جمادات اور نباتات اپنے اپنے اعمال کی جواب دہی کیلئے جلالِ خداوندی کے حضور کھڑے ہیں اور دُنیا کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس نے دیکھا! آیات و معجزات کا سرچشمہ مصرِ خطابت کے منبر پر کھڑا ہُوا، اپنی نگاہوں کو فضا کے چاروں طرف گردش دی اور ایک عجیب آواز میں یوں گویا ہُوا:

"اے زمین پر رہنے بسنے والی قومو اور نسلو! سُن رکھو کہ میرے سوا زندگی کے راز کو کسی نے منکشف نہیں کیا اور انسان کے بھید کو میری طرح کوئی نہیں سمجھا ہر چیز باطل ہے — انسانی صنعت باطل ہے، دنیوی سہارے فانی ہیں، انسان کی عظمت و بزرگی ہنگامی ہے اور اس کے کارنامے کسی معمولی چیز کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس لئے موت تمام دُنیا پر حکمراں اور ابن آدم پر غالب ہے۔ موت ساری چیزوں کو کھا جائے گی اور تمام کائنات کو تتر بتر کر دیگی تمام مخلوق موت ہی کے لئے جلیتی اور عمر پاتی ہے اور قیامت ابھی بہت دُور ہے! بس اے خواہشو اور مسرتو! دُور ہو جاؤ! اور تُو اے بیچارے انسان اپنے بڑھاپے کو انتہائی بلندی پر لے جا، جہاں تیری عمر کی مدت طویل ہوتی

ہے اگرچہ برائے نام"

اس کے بعد عالمِ یونان کھڑا ہوا، وہ تابناک عالم، جسے ایک فلسفی نے شفاف آسمان، فروزاں چراغ اور شاداب جوانی سے تشبیہ دی ہے لیکن جب اس نے اپنے فلسفیوں کی فصاحت اور شاعروں کی بلاغت کے سہارے کلام کرنا چاہا، تو اس کی زبان بل کھا کے رہ گئی اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے دیوتاؤں کی زبان میں یوں خطاب کیا:

"زندگی" زندگی کے لئے پروان چڑھی ہے، اے ابن آدم! اپنی زندگی کا دامن دراز کر، اس کی مدت بڑھا اور اس کے ساتھ اس کی اُمیدوں اور آرزوؤں کو بھی وسعت دے! کیا تو نہیں دیکھتا کہ فطرت اپنی مہک سے روحوں میں انتعاش پیدا کرتی ہے اور اپنے محاسن سے نگاہوں کو اپنا غلام بناتی ہے دنیا ہر چیز کو محیط ہے، جو کچھ دیوتاؤں کی ملکیت ہے، وہ بھی اسی کے لئے ہے۔ ہر چیز اس کے اقتدار میں ہے اس لئے وہ راستہ تلاش کر جو اس تک پہنچاتا ہے اور مضبوط قدم اور مستحکم دل کے ساتھ اس پر چل اور نعمت اندوز ہو اے ابن آدم! اے دیوتاؤں کے مماثل!

اس مسرت میں غرق ہو جا اور بے کیفی کو اپنے اوپر مسلط نہ ہونے دے اے دنیا کی باگوں کے مالک اور اے دنیا کے سردار!

اپنے حسین سر کو سدا بہار غار کے تاج سے زینت دے، اپنی نظر فریب گاڑیوں میں سوار ہو اور سیر گاہوں اور تفریح گاہوں میں سیر کرتا پھر جہاں تو شعور کو کشادہ اور سینوں کو ٹھنڈا ہی دیکھے اس کے سوا کچھ تجھے نظر نہ آئے، یاد رکھ! دیوتا دنیا پر حکومت کرنے کیلئے پیدا کئے گئے ہیں لیکن حسن دیوتاؤں اور دنیا دونوں کی حفاظت و نگہبانی کرتا ہے۔ وہ ان دونوں کا آقا بنایا گیا ہے پس اے ابن آدم! تو بھی حسن کی تمنا کر اور یقین رکھ کہ وہ مخلوقات کا کعبہ، صفلۂ اوقات کا سرچشمہ اور تاریکی کی کدورتوں کو جلا بخشنے والا ہے بلکہ وہ احوال میں حاکم اور عزائم و اعمال میں مشیر ہے۔ زندگی، زندگی کے لئے پیدا کی گئی ہے، حسن کے لئے پیدا کی گئی ہے، لذتوں کیلئے پیدا کی گئی ہے۔ اس لئے تو اس سے دامن نہ بچا پہلو تہی نہ کر بلکہ اسے اپنے قلب و فکر کی تمام قوتوں کے ساتھ جذب کر اور جلیتے جی اس سے چمٹا رہ!"

اس کے بعد ایک گہرا سکوت چھا گیا جس کے عقب میں دو حوں

کی سرگوشیوں کی سرسراہٹ تھی اچانک مہیب کڑک کی سی ایک آواز بلند ہوئی جس سے سمندر کی گہرائیاں لرز اُٹھیں اور پہاڑوں کی بلندیاں کانپنے لگیں یہ رونقہ الکبریٰ کی آواز تھی جو اپنے جسم پر فولادی لباس لپیٹے کھڑا تھا اس نے اپنی تابناک تلواریں اور چمکیلے نیزے فضا میں لہرائے اور بڑے اکھڑ لہجہ میں کہا:

"انسان کی زندگی کو میرے سوا کسی نے نہیں سمجھا اور یہ زندگی عظمت و سیادت کی زندگی ہے اور بس! اس میں کوئی شک نہیں کہ سکون و اطمینان کی حالت انسان کیلئے وجہ ننگ ہے اور اسی طرح اے ابن آدم! صنعتوں اور پناہ گاہوں کی حالت ان سب چیزوں سے قاصر ہے تاکہ تو اپنی عمر ان پست مجبوروں اور بے مایہ کباڑوں میں ضائع نہ کرے لیکن حقیقی زندگی بڑے بڑے اعمال کی زندگی ہے اور انسان جب اپنا وقت پورا کرلے اور فخر و سیادت سے ہمکنار نہ ہو، تو ضعیف و بزدل شمار کیا جاتا ہے پس ان چیزوں سے اپنا دامن چھڑا اور اے انسان! مجد و شرف کی طرف دوڑ! اور سرداروں کی ہمسری و مسابقت کے رستے سے نہ ہٹ بڑے بڑے معاملات سے شغف پیدا کہ اس لئے کہ ان کے نتیجہ میں شاندار

بزرگی ہے اسے اپنی تمام قوتوں کے ساتھ طلب کر اور اس سے نہ ڈر کہ تجھے مذبح جنگ میں خون کے دریا میں غوطہ لگانا اور مقتولین کے اعضا کو روندنا پڑیگا کہ اصل عظمت اور غیر معمولی فخر پہ تو اسی سے فائز ہوگا اور شہرت و ناموری کے بعد وہ کچھ حاصل کرے گا، جو تجھے زندگی کا محبوب بنا دیگا، اور جس کی طلب زندگی کی شگفتگی تجھ سے کرتی ہے۔

جہاں تک ہو سکے مجد و اجلال کی راہ میں کوشش کر اور دُنیا کو اپنے اُوپر غالب آنے، اپنے ہاتھ باندھنے کا موقع نہ دے۔ جان لے! کہ دُنیا کی کوئی حد نہیں اور اسی لئے ارادہ کی بھی کوئی حد نہیں۔ پس اے خشونت و سنگدلی کے بیٹے! دُنیا پہ جھپٹ! حملہ کر! اے ذہین درندے! اس سے آخر کار تو آسمان پر بھی غلبہ پالے گا فخر کی بلندیوں کو پامال کریگا اور بندگی کی گہرائیوں میں اُترے گا!"

جب روم اپنی تقریر ختم کر چکا تو کائنات میں ایک ہولناک اضطراب پیدا ہوا۔ لیکن اس کے فوراً ہی بعد شدید سکون طاری ہوگیا ابن صحرا چونکا اور دیکھا کہ روم اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مشرق کی طرف دیکھ رہا ہے۔ یونان اپنی حسن اور لذت میں ڈوبی ہوئی نگاہوں سے مشرق کو تک

رہا ہے اور مصر کی چندھیائی ہوئی آنکھیں بھی مشرق پہ جمی ہیں۔ مشرق کے
اس چھوٹے سے قطعہ کی طرف جمی ہیں، جس میں وہ قلیل التعداد قومیں آباد
ہیں جس کی زمین پہ دنیا میں سب سے پہلے رحم، ہمدردی، محبت اور انسانیت
کے پھول کھلے جہاں وہ انسان آیا جو برائی، ظلم، کمینگی اور رذالت سے
یکسر پاک تھا اور جس کی بے آب و گیاہ چٹانوں سے ــ جن پہ موسیٰؑ
کھڑے ہوئے، عیسیٰؑ کا نزول ہوا اور محمدؐ مبعوث فرمائے گئے ــ
دنیا میں زندگی کی حقیقی نعمت کے چشمے جاری ہوئے اور ساری مخلوق
اس کی برکتوں سے مالا مال ہو گئی، جس نے انسانیت کے سینے
سے بدبختی کے قدموں کا بوجھ ہلکا کیا اور دنیا کے ہر پرچم کو اپنے سائے
میں لے کر انسان کو اس کے اعمال کی عظمت اور زندگی کے راز سے
آشنا کر دیا، اور کائنات کی گتھیاں سلجھا دیں۔

سمندر کے کنارے

جہاں دوپہر ہوئی، میں نے کھانا کھایا اور اپنے ایک ہم مکتب دوست کو ساتھ لے کر سمندر کے کنارے چلا گیا۔ اُن چٹانوں کی چوٹی پہ پہنچ کر، جو سمندر پر سایہ فگن تھیں، ہم دونوں کوئی ٹھنڈی جگہ تلاش کرتے، جہاں بیٹھ کر، دن کی تپتی اُبلتی گھڑیاں، کبھی ماحول کی نظارہ سازی میں، اور کبھی فکر و مطالعہ کی انہماک آفرینیوں میں بسر کر سکیں۔

سب سے پہلی کتاب، جس پہ میں نے اپنی دماغی قوتیں صرف کیں، ایک چھوٹی سی اطالوی تصنیف "جاکوپی اورتیس کے خطوط"، فنی ۱۰ اس

کتاب میں محبت اور سیاست سے ایک ساتھ بحث کی گئی تھی اور یہاں نوجوانوں میں بہت مقبول تھی، جو ہماری طرح عشق کے تمغے اور سیاست کے تاج سے اپنے تئیں آراستہ کرتے ہیں۔

پھر میں نے برنار دین دی سان پلیر کا ناول "پال اور ورجینا" پڑھا یہ مختصر سی کتاب، جس میں سچی محبت کی بڑی دلگداز تصویر کھینچی گئی ہے، میرے خیال میں سلاطین زادوں کی نصیحت کے لئے ایک گراں قیمت صحیفہ ہے، جسے سولہ برس ہوئے، انسانی تاریخ کے بیچ میں سے پھاڑ کے، نہایت عفت و پاکیزگی کے ساتھ، آنکھوں سے لگاتار بہنے والے آنسوؤں کی صورت میں، محفوظ کر دیا گیا ہے۔

اس کے بعد میں نے "تاسیت" کا مطالعہ کیا اور یہ وہ کتاب ہے، جس کا ایک ایک صفحہ ننگ و فساد کی لوٹ ہے۔ کیونکہ اس میں، ایک مستحکم ارادہ کے ساتھ، فضیلت کو نقاش کے قلم پر قابض دکھایا گیا ہے کہ وہ ایک نقش کھینچے ـــــ غیر مبہم اور اس تاریخ کے اثر سے بےکیر آزاد نقش، جو اُن لوگوں کے لئے نازل کی گئی ہے، جن کے نزدیک تاریخ ظلم و استبداد اور بشدت لوگوں کو اپنا غلام بنانے کی قوت کا

ایک جزو ہے۔

یہ تینوں کتابیں ان حسیّات کا آئینہ ہیں، جو ایک زمانے سے گویا دل کی رہنمائی کر رہی ہیں۔ چنانچہ وہ ہماری روحوں میں محبّت، ذکاوت اور تانیثیت کے پیش کردہ عظیم الشان کاموں کی صلاحیت کے تاروں کو جنبش میں لاتی ہیں اور انھیں اُن کی نوعمری ہی کے زمانے سے، سال خوردہ فضیلت کی آگ میں جھونکنا شروع کر دیتی ہیں۔

ہم بلند آواز میں پڑھتے۔ کبھی حیرت میں ڈوب جاتے اور کبھی رونے لگتے۔ کبھی سوچ میں پڑ جاتے اور کبھی ایک طویل و عمیق سکون ہم پر طاری ہو جاتا، جس میں صرف چند آہوں کا تبادلہ ہوتا، جیسے وہ ہمارے انفعالات کو مس کئے بغیر بلند ہو رہی ہوں اور ہوا کے ساتھ ہمارے خوابوں کو اُڑا لے جاتی ہوں۔ پھر تصوّرات ہمیں ان تخیّلی موضوعات کی طرف لے جاتے جو شاعر یا ادیب ہمارے سامنے بیان کرتے ہیں اور ہمیں ایک خیالی عاشق، ایک وطن پرست اور ایک مجاہد حیات کی جگہ لا بٹھاتے ہیں۔

دن ڈھلے، ہم طویل مسافت طے کر کے شہر واپس آتے، ہماری

جلیبیں اور مٹھیاں تحفوں سے بھری ہوتیں اور گھر کے صحن میں گھر والوں کے ساتھ جمع ہوتے دنیا میں اگر کوئی شے مسرت بخش اور تصویر کشی کے قابل ہے، تو صرف چاندنی میں صحن کا منظر اور آلاتِ موسیقی کے وہ نغمات ہیں، جو سمندر میں موجوں کے تھپیڑے کھانے والے پودوں کی کراہ یا دوپہر کی خاموش فضا میں دھوپ کی ماری مینائی پکار سے مشابہ ہوں چنانچہ فضا میں، ہیئتوں میں، اور یہاں تک کہ اس فرحت بخش ہذیان کے رجوم و جنون میں بھی ایک طرح کے وقار و حزن کی جھلک پائی جاتی تھی، جیسا کہ ہر خوشی، زائل شدہ جنون ہوتی ہے اور بس! یہی حال شباب و جمال کا بھی ہے۔ اس لئے کہ وہ بھی سعادت و کامرانی میں روشنی اور چمک حاصل کرنے کے لئے سبک سری کے محتاج ہوتے ہیں اور مدہوشی و بیخبری کے عالم میں پہنچ جاتے ہیں اور نغمہ ہائے ساز چاہے کتنے ہی طرب خیز کیوں نہ ہوں ان کے اثرات فرحت و سرور کی چاہے کتنی ہی ترجمانی کیوں نہ کریں، دل کے سوئے ہوئے تاروں کو جنبش میں لانے اور روح کی گہرائیوں میں اُتر جانے کی قوت نغم آفریں سُروں الم انگیز راگوں اور دلکش و دل شکن سُرکے ہی میں ہوتی ہے۔

موسیقی کا ہر جگہ یہی حال ہے وہ فقط کانوں ہی کے لئے جنبش نہیں ہے بلکہ ان خواہشوں اور تمناؤں کی حرکت بھی ہے، جو آواز کے ساتھ انسان کے دل سے نکلتی ہیں۔ یہ تمام حرکات ٹھنڈے سانس ہیں اور یہ تمام علامات آواز کے ساتھ آنسوؤں کا تار باندھ دیتی ہیں۔

پس ناممکن ہے کہ ہم آنسوؤں کا جام مسلسل چھلکائے بغیر بشدت دل کا دروازہ کھٹکھٹا سکیں جب کہ فطرت ایک گہرے غم سے لبریز ہو اور اس کا محرک ہمارے ہونٹوں سے لحن اور ہماری آنکھوں سے آنسو جاری کر رہا ہو اور جب کہ ہم ایک دوشیزہ سے نقارہ کی لَے پر تارنتلا[1] کا رقص کرنے کی باادب درخواست کریں وہ نقارہ کی لَے پر چٹکیاں بجاتی ہوئی رقص کی جنبشوں میں کھو جائے اور پسینہ اس کے پاؤں پر اس طرح گرنے لگے، جیسے بارش کے قطرے زمین پر گرتے ہیں۔

یا اللہ! کتنا حسین تھا وہ منظر اور کتنا شدید اثر ہے اس کا میرے نفس و شعور پر کہ اس واقعہ کو بیس برس ہو چکے ہیں لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے گویا آج ہی کی بات ہے بلکہ اسی ساعت کی بات ہے، جو مجھ پر گزر رہی ہے۔

---

[1] اٹلی کا لوک ناچ

سمندر کے کنارے

نوجوانی کے انتہائی پُرمسرت دن اسی طرح باقی رہتے ہیں! ان کا اثر جوانی بڑھاپے اور انسان کی زندگی کے آخری لمحات تک روح میں اسی طرح رچا رہتا ہے کہ بڑھاپے میں تسلی کا سامان ہو اور مرتے وقت صبر کا پیام!

اگر یہ صفحہ میری اسی پہلی زندگی کا صفحہ ہے، جو میں نے اطالیہ کے آسمان تلے، نابولی کے ٹیلوں کے درمیان اور سمندر کے ساحل پر موجوں کے تھپیڑوں میں بسر کی ہے، تو پھر یہ میری روح، میرے جذبات اور میرے شعور کے لئے ایک سرمدی صفحہ ہے جو اپنی اسی تاثیر سمیت میری دوسری زندگی میں عرش خداوندی کے نیچے بھی قائم و دائم رہے گا۔

منفلوطی کا یہ زندۂ جاوید ناول

اردو میں حبیب اشعر نے منتقل کیا ہے

شہناز

محبت میں ناکام ہونے کے بعد عام انسان
خود کشی کر لیتا ہے۔ لیکن ایک فن کار
اپنے فن کو غیر فانی بنا دیتا ہے۔
یہ ناول ایک فن کار کی حسرت نصیبیوں
کا الم ناک مرقع ہے جس نے محبت میں
ناکام ہو کر اپنے فن کو غیر فانی بنا دیا۔

قیمت پانچ روپے

☆

گوشۂ ادب (چوک انارکلی) لاہ